اللہ اکبر

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

(علامہ شبلی نعمانی)

CHECKED

خلافت اور انگلستان

1987

مرتبہ

CHECKED 1988

ڈاکٹر سید محمود صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ پٹنہ

زیرِ نگرانی

منشی مشتاق احمد صاحب ناظم قومی دارالاشاعت محلہ کوٹلہ شہر میرٹھ

لالہ ہرنام داس صاحب گپتا کے
راج پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپوا کر
محمد امتیاز نے صداقت آشرم پٹنہ سے شائع کیا

تیسری مرتبہ

قیمت عہ

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

رئیس الاحرار مولانا محمد علی صاحب کی تصنیف

تقاریر مولانا محمد علی صاحب حصہ اوّل

امرتسر دہلی۔ بمبئی۔ پیرس۔ لاہور۔ کلکتہ کی مشہور تقریروں کا مجموعہ ۸/

تقاریر مولانا محمد علی صاحب حصہ دوم

کراچی۔ الہ آباد۔ گجرات۔ احمد آباد۔ لکھنؤ کی زبردست تقریروں کا مجموعہ ۸/

خطبہ صدارت مولانا محمد علی صاحب۔ دہلی و لکھنؤ کانفرنس ۵/

جذبات جوہر (مجموعہ نظم) ۲/۰

تقریر مدراس ۳/ بیان مقدمہ کراچی ۴/

تصانیف حضرت مولانا عبدالماجد صاحب بدایونی

الاظہار

مسئلہ خلافت اور واقعات پنجاب۔ علماء کے فرائض پر لاجواب تصنیف ۸/

درس خلافت

تقریر سکھانے والی وہ مشہور کتاب جو چھٹی مرتبہ چھپی ہے ۸/

المکتوب

دس ہزار میل کا حضرت مولانا عبدالماجد صاحب کا خود نوشت سفرنامہ بلگام اور بہار کانفرنس کی دو مشہور تقریریں۔ بنگلور۔ میسور۔ نیلگری۔ بمبئی۔ کراچی۔ پٹنہ وغیرہ کے مفصّل حالات محراب لرزاں کی کیفیت ۸/

جذبات الصداقت

حضرت مولانا کے چند نایاب مضامین کا مجموعہ ۳/۰

مشتاق احمد ناظم قومی دارالاشاعت محلہ کوٹلہ شہر میرٹھ

تہدیہ

مولانا شوکت علی اور محمد علی نے [illegible]

خدمات انجام دی ہیں وہ ایسی نہیں ہیں کہ کوئی مسلمان کبھی ان کے

احسان سے عہدہ برآ ہو سکے۔

میں اپنی یہ ناچیز تالیف ان دونوں بھائیوں کے نام نامی کے ساتھ

معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔

محمود

اپریل ۱۹۱۵ء میں میں نے انگریزی رسالہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ" میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں خلافت کا تاریخی پہلو دکھایا گیا تھا اُس وقت سے ابتک دُنیا بہت کچھ بدل چُکی ہے۔ خلافت کا مسئلہ آج کل اس قدر اہم اور وسعت پذیر ہوگیا ہے کہ اس نے یورپ کے اہلِ تدبیر کو متردد بنادیا ہے۔ یہ مسئلہ زمانہ حاضرہ کے اُن مسائل میں سے ہے جن کا گھر گھر چرچا ہے۔

اس رسالہ میں کسی غیر واجبی جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس مسئلہ کا حل علمی طریقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ اور کوشش کی گئی ہے کہ ایک بے لوث مورّخ کی حیثیت سے تاریخی واقعات پیش کردئے جائیں اصلاً میں نے اس رسالے کو انگریزی زبان میں لکھا تھا جو اس رسالہ سے ایک مہینہ قبل چھپکر تیار ہوچکا ہے۔ اس کو ابتداءً انگریزی زبان میں تصنیف

کرنے سے میرا یہ مقصد تھا کہ خلافت کے مسئلہ کی حقیقت کو غیر ملکوں کے اہل الرائے اشخاص کے سامنے رکھ دیا جائے۔ اس کے بعد بعض دوستوں کی یہ رائے ہوئی کہ اس کو ہندوستان کی عام فہم زبان "اردو" میں ترجمہ کر کے اپنے اہل وطن کو بھی اس کے مطالعہ کا موقع دیا جائے اگرچہ میں اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے انگریزی رسالہ کا اردو ترجمہ خود نہ کر سکا۔ لیکن مجھے مسرّت ہی کہ بعض دوستوں کی مدد سے میں اُن لوگوں کی جو اس کو اردو میں پڑھنا چاہتے تھے خواہش کے پورا کرنے میں آج کامیاب ہوا۔ امید ہے کہ میرے اہل وطن اس رسالہ کو شرفِ قبولیت عطا کرینگے۔ فقط

پٹنہ
۳۰۔ جون سنہ ۱۹۲۱ء

خاکسار
سیّد محمود

نہیں دی جا سکتی جب تک کہ اس کی عملی مثال پیش نہ کی جائے اور مسلمان اسلامی ترقی کی مثال صرف "آزادی" میں قائم کر سکتے ہیں اسلامی تہذیب قوانین الٰہی پر مبنی ہے۔ خلیفہ اس کا دنیوی سردار ہے خواہ وہ اہل عرب ہو یا غیر اہل عرب خواہ اس کا دار الحکومت بغداد ہو مدینہ ہو یا قسطنطنیہ اور اسلامی تہذیب اور ترقی کا مرکز مرکز خلافت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے۔ یورپ کے تمام فضلا اس بات کو تسلیم کرینگے کہ مدینہ اور بغداد وہ دار الخلافہ تھے جو دنیا کے لئے ہمیشہ چشمۂ فیض بنے رہے لیکن استنبول کے متعلق اکثر اشخاص یہ رائے نہیں رکھتے۔ حالانکہ استنبول کی حالت بھی ویسی ہی رہی ہے۔ کم سے کم اس زمانہ میں جبکہ یورپ میں تعصب کی آگ بھڑک رہی تھی اور غیر مذہب والے مذہبی اختلافات کی وجہ سے لوگوں کو زندہ جلا دیا کرتے تھے اس صورت میں استنبول ہی مظلوموں کے لئے جائے پناہ تھا۔ اس کے علوم و فنون کی صحیح قدر نہیں کی گئی اور اس کی روشن خیالی کو اب تک سوائے چند نکتہ بیں مستشرقین کے اور کسی نے تسلیم نہیں کیا۔ جو کچھ بھی ہو لیکن یہ یقینی امر ہے کہ اس نے عمداً دنیا کے سامنے اسلامی ترقی کا نمونہ پیش کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس کی یہ وجہ ہے کہ ابتک وہ عیسائیت کے حملوں کا آماجگاہ بنا رہا۔ صرف چودہ سال ہوئے کہ ترکوں میں عظیم الشان

بیدار ہونے کے آثار نمایاں ہوئے۔ اُنہوں نے اسلامی نقطۂ نظر سے اپنی
کمزوریوں کو محسوس کر لیا اور اُن کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یورپ کے پاس
اُن کو نظرِ حقارت سے دیکھنے کے کچھ نہ کچھ وجوہ موجود ہیں۔ وہ یورپ سے
دستِ مصالحت دراز کر کے آشتی و صلح کے طالب ہوئے اور اتنی مہلت
چاہی کہ وہ خدا کی مدد سے اپنے ملک میں اور نیز اپنے طرزِ زندگی میں اصلاحات
کر سکیں اور اسلامی ترقی کی ایسی مثال پیش کریں جس کی اہل یورپ
بھی داد دیں۔ یہ اُن کی بربادی کا پیش خیمہ تھا۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب
کے بعد جبکہ ترکوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ یورپ کی مدد سے
ترقی کریں گے۔ اور اس خواہش کے پورا کرنے میں جو کچھ مشکلات اُن کو
پیش آئیں اُس سے ہر شخص بخوبی واقف ہے۔ ہر مسلمان اس امر سے
بخوبی آگاہ ہے کہ جب اس اسلامی سلطنت میں اصلاحات ہو رہی
تھیں عیسائی سلطنتوں نے اسے گوارا کیا۔ لیکن جب وہ بام ترقی
پر پہنچنے کے قریب ہوئی اور اس میں سچا اسلامی جوش پیدا ہو گیا۔ اُس
وقت بہت سختی سے اس پر حملہ کیا گیا۔ اور اس کو پارہ پارہ کر دیا گیا
اس کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیوں کو اپنی جدید تہذیب پر ناز تھا اور اس
لئے وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو اتنا بھی موقع دیں کہ وہ دُنیا
کو یہ دکھا سکیں کہ اسلامی تہذیب کس قدر ارفع و اعلیٰ ہے اور

از عالی جناب مظہر الحق صاحب۔ پٹنہ

عیسائیت نے سب سے اوّل اس قدیم تہذیب و تمدّن کی تیار شدہ فصل کو تباہ کیا جس سے ہم بہت کچھ متمتع ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد اس نے اسلامی خرمنِ تہذیب کو برباد کیا اور سب سے آخر اس نے اُندلس کی اسلامی تہذیب کو پامال کیا۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ یہ پامالی کن قدموں کی برکت تھی! کیوں؟ اس لئے کہ اس کی بنیاد شرافت و شجاعت کے فطری جذبات پر تھی اور اس لئے کہ اس کے اندر اُندلس کی سی لطیف و اعلیٰ زندگی کا پیام دعوت پنہاں تھا۔

نیٹشے (اینٹی کرائسٹ)

اس کے بعد صلیبی نبرد آزماؤں نے ایک ایسی شے کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جس کے آستانہ پر اس کو جبہ سائی کرنی تھی۔ یہ شے وہ تہذیب و تمدن تھا جس کے سامنے ہماری انیسویں صدی کی تہذیب بھی بے مایہ و فرسودہ معلوم ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ مشرق دولت مند تھا اور یہ لوٹ کے خواہاں۔ اب ان جاہلانہ تعصبات کو ہمیں بھول جانے دو صلیبی لڑائیاں ایک اعلیٰ قسم کی قزاقی تھیں اور کچھ نہیں۔

(ایضاً)

یہ کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو بار بار دہراتی رہتی ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی دماغ میں بعض خواص ایسے ہیں جو عرصہ دراز تک سوتے رہنے کے بعد بھی بیدار ہو کر رہتے ہیں۔ خیالات اکثر مختلف صورتوں اور مختلف ناموں سے رونما ہوتے ہیں مگر دراصل وہ ایک ہی ہوتے ہیں۔ گو کہ انسان نے اپنی خودغرضیوں سے اکثر اس مطابقت اور یکسانیت کا انکار کیا ہے۔ اقتدار پسندی ایک عالمگیر جذبہ ہے جو بارہا ہمارے تمام روحانی اور اخلاقی جذبات مثلاً دیانت عدل۔ اور خوش معاملگی پر حاوی ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ مذہبی ناروا داری کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اور کبھی قومی برتری کی شکل اختیار کرتا ہے۔ فتوحات۔ الحاقات۔ نگرانیاں و حکم داری

سے جو مختلف اشکال اور نام ہیں جن کے پردہ میں اقتدار پسندی کی خواہش اپنا کام کرتی ہے۔ قرون وسطیٰ میں اسی خواہش نے مذہبی ناروا داری کی صورت اختیار کی جس نے اسلامی تہذیب کو تباہ کیا اور جس کے متعلق نیٹشے نے فصیح مگر آتشیں الفاظ میں تنفر کا اظہار کیا ہے۔

اس بیسویں صدی میں یہ خواہش قومی برتری اور سفید نسل کے غلبہ کی صورت میں نمودار ہوئی ہے اور رہی سہی اسلامی تہذیب کو پھر ایک بار سرے سے تباہ کر دینا چاہتی ہے وہ کبھی اُن مصائب تکالیف اور آلام کی پروا نہیں کرتی جو تخریب کے جنون میں نسل انسانی کے ایک حصہ کے سر ڈالتی ہے۔

قرون وسطیٰ میں لوگوں کو پتھر کے سونا بن جانے کی امید تھی ایسی اور کوئلہ کی طمع ہے جو چاندی سونے میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ یہ اعلیٰ درجہ کی نہیں ہے بلکہ نہایت ذلیل قسم کی قزاقی ہے۔ انسان نے اس خواہش کو بلا کسی روک ٹوک کے اس حد تک بڑھنے دیا کہ بعض بڑے آدمی ایسے گزرے ہیں جن کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ خواہش اِن میں فطری ہے اور جو باوجود انسانی کوشش کے دور نہیں کی جا سکتی۔ بلاشک یہ عقیدہ اس وقت تک قائم رہے گا

جب تک انسانی افعال کی رہنمائی خالص مادی خواہشوں پر منحصر رہے گی۔ لیکن ایسا وقت ضرور آئے گا جب محض بقائے نوع کی خاطر دنیا وسعت نظر سے کام لے گی۔ اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کرے گی اور بالآخر یہ بات تسلیم کرے گی کہ اقتدار پسندی کی خواہش بری چیز ہے جس کے خلاف جہاد کرنا چاہئے۔ ایسا دیر یا سویر ضرور ہو کر رہے گا۔ اور کوئی تیسری صورت نہیں ہے بحالیکہ موجودہ انسانی دنیا بڑی سرعت سے اپنے زوال کی طرف جا رہی ہے۔ اگر اس کو روکا نہ گیا تو وہ یقیناً برباد ہو گی۔ گزشتہ جنگ یورپ اس کی بین مثال ہے۔ اس عالمگیر جنگ میں انگلستان کی شرکت کا پہلا سبب تو وہ خواہش تھی جو آرزوئے بقا کہلاتی ہے ایک عالمگیر جنگ میں عالمگیر اقتدار والی طاقت کا غیر جانبدار رہنا ناممکن تھا۔ انگلستان کے مقبوضات تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ان کی حفاظت اور نگرانی کرنا ضروری تھا۔ سب سے اہم سوال ہندوستان کا تحفظ تھا۔ اگر ہندوستان ہاتھ سے نکل جاتا تو سلطنت انگریزی کا نہایت ذلت کے ساتھ خاتمہ ہوتا۔

ٹیوٹن نسل کی تجارتی رقابت اور جرمنی کی بحری قوت کا انگلستان کے مقابلہ میں عروج اس شرکت جنگ کے مزید فیصلہ کن اسباب

تھے۔ بظاہر انگلستان نے دنیا میں مشتہر کیا کہ شرکائے جنگ کی
فہرست میں اس نے بنی نوع انسان کی ہمدردی کے خیال سے اپنا نام
لکھایا تھا تاکہ راستبازی اور انصاف کی خاطر چھوٹی قوموں کے
حقوق کے تحفظ کے لئے ان کی مدد کی جائے اور موجودہ تہذیب کو جو
یورپی دول وسطیٰ کی جنگ جویانہ اسپرٹ کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گئی
تھی قائم رکھا جائے، کوئی ظاہری لالچ۔ کوئی تجارتی مقصد یا
ملک گیری کا خیال اس کے دماغ میں نہ تھا۔ جب جنگ میں اس کی شرکت
مسلّم ہو گئی تو اس نے اس انگریزی مقولہ پر عمل کیا۔

"عشق اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے"

اس نے ہر ممکن ذریعہ سے فتح حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کو کسی نہ
کسی طرح فتح حاصل کرنا تھی۔ اس کی رعایا میں سے سپاہیوں کی کثرت
اس کی ضرب المثل دولت اس کی دوربیں حکمت عملی۔ اور اس کے
ضرورت سے زیادہ فیاضانہ عہد و پیمان اس کی کامیابی کا سبب
ہوئے۔ اس لڑائی میں تین سلطنتیں انگلستان کی مد مقابل تھیں جن
میں سے ہر ایک کو نیچا دکھاتا تھا۔ جرمنی اصلی مجرم تھا۔ مگر وہ شکست
کھانے پر بھی بہت زیادہ طاقتور ہے اور تباہ ہونے والا نہیں،
اس پر بھاری تاوان عائد کر کے اس کو برباد کرنے کی کوششیں کی گئیں

چھوڑ انگاں شامت منقلب سے اس کی گردن اسی تپ تھی جنہیں چھوٹی ...
اور کشت وخون پر آمادہ ہے۔ مگر دو آسٹریا پر سے ٹکڑے ٹکڑے پارہ
پارہ کر دیا گیا۔ اب وہ غریب سر نہیں اٹھا سکتا۔ رہا غریب
لاچار تباہ حال ٹرکی مریض اور یورپ کا خارچشم ٹرکی۔ اس کو
ضرور صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہے۔ اس کا جرم ناقابل معافی
ہے کیونکہ وہ مذہبًا مسلمان ہے اور نسلاً تاتار ہے جس کے
وجود کو عیسائی یورپ گوارا نہیں کر سکتا۔ ایشیا میں اس کی
موجودگی انگلستان کے مقبوضات کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہے
کیونکہ وہ ہندوستان کے راستے میں حائل ہے۔ اسلام میں
اس کا روحانی اقتدار ہے۔ اس لئے مسلم اقوام پر انگریزی
اقتدار قائم رکھنے کے لئے ہر وقت اس سے خطرہ رہتا ہے
چنانچہ ٹرکی کی تباہی کے لئے اتحادیوں کی قوت کا پورا زور
لگا دیا گیا اور کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ اس کی رعایا کو رشوت
میں زر و مال دیا گیا۔ اور اس طرح ان کو بغاوت پر آمادہ کیا گیا۔
اس کے گورنر خیالی خود مختاری کے خالی وعدوں سے جادۂ
اطاعت سے منحرف کئے گئے۔ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو
یہ یقین دلایا گیا کہ یہ لڑائی مذہبی جنگ نہیں ہے اور اسلام کے

مقدس اماکن ہر طرح محفوظ رکھے جائیں گے اور اس کے دینی امور کو کسی قسم کا صدمہ نہ پہنچایا جائے گا۔ اور اس طرح سے مسلمانوں کو ان کے ہم مذہبوں سے لڑا دیا گیا۔

بیشک اس قسم کے وعدوں کا پورا کرنا اثنائے جنگ میں ممکن نہ تھا مگر ایسی بے پروائی سے کارروائی کی گئی کہ وعدہ شکن اور بدکرداروں کو انتقام کی دیوی نے جلد آلیا۔ دورانِ جنگ میں مسلمانوں کو خبروں کے سخت احتساب نے ایک گونہ تاریکی میں رکھا اور وہ اس حقیقتِ حال کو کہ ان کے مقامات مقدسہ میں کیا کیفیت گزر رہی ہے معلوم نہ کر سکے لیکن لڑائی ختم ہونے کے بعد جب صحیح حالات معلوم ہونا شروع ہوئے تو اسلامی دُنیا میں آگ لگ گئی۔ چالیس کروڑ پیروانِ اسلام کو اس درجہ مایوس کیا گیا ہے کہ ان پر ایک قسم کی دیوانگی سی طاری ہو گئی ہے اگر ہندوستان کے نامور سپوت مہاتما گاندھی جی۔ جنھوں نے خطرہ کو سر پر کھڑا دیکھ کر لوگوں کی ارادی قوتوں کو خاموش ترکِ موالات کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ آڑے نہ آجاتے تو ہندوستانی مسلمانوں کے غیض و غضب کی کچھ انتہا نہ ہوتی اور یہ معاملہ نہایت ناخوشگوار اور ناقابل برداشت صورت

اختیار کر لیتا تھا۔ افغانی، مصری، ترک، عرب، سب انگلستان
کے خلاف ہیں کیونکہ وہ اس کو اپنے مذہب کا برباد کرنے والا
سمجھتے ہیں۔ ٹرکی کی ہستی ایک دنیوی طاقت کی حیثیت سے مٹادی گئی
اور اس وجہ سے منصب خلافت جو اس سے متعلق تھا محض ایک نام
رہ گیا۔ انگلستان کے ہاتھ میں خلیفۃ المسلمین کی حیثیت ایک بے بس
قیدی کی ہے۔ تازہ اطلاعات کے بموجب وہ دشمنوں کا حملہ روکنے کے
لئے اپنے پایہ تخت میں فوج بھی جمع نہیں کر سکتے۔ فرانس اور اٹلی عہدنامہ
سیورے کی ترمیم پر رضامند تھے، صرف انگلستان مخل ہوا۔ اور یہ کیوں
محض اس وجہ سے کہ انگلستان اس جنگ کی لوٹ کا بہترین لقمہ نگل چکا ہے
جس کو وہ اُگلنا نہیں چاہتا۔ اس لوٹ کو ہضم کر جانے کی ہر طرف سے
مضطربانہ کوششیں کی جا رہی ہیں جس طرح دوران جنگ میں عہد و
پیمان کی بہتات تھی اسی طرح بعد از جنگ انکار و تبرّی کی کثرت ہے۔ اسلام
کے مقامات مقدسہ کی بے حرمتی کا انکار ہے۔ عربوں سے جو وعدے
کئے گئے تھے ان کا انکار ہے۔ مسٹر لائڈ جارج کے صاف صاف وعدوں
سے بھی انکار ہے یہانتک کہ منصب خلافت سے بھی انکار ہے۔ اس کے
متعلق دنیا سے کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ حال کی پیداوار اور پان اسلام
ازم (عالمگیر اتحاد اسلامی) اور مرحوم سلطان عبدالحمید خاں کی

اختراع کی۔ ایسے آدمیوں کا ایک گروہ اٹھ کھڑا ہوا ہے جو واقعات
کو توڑ مروڑ کر اسلامی تاریخ از سر نو لکھنے کی کوشش کر رہا ہے
اور اپنے متعصبانہ خیالات (جو پہلے سے قائم کر لئے گئے ہیں)
پیشگوئیوں کے سانچے میں ڈھال رہا ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے لوگ اپنی حب الوطنی
کی اجرت کے مستحق ہیں لیکن کوئی شخص ان کے پیش کردہ واقعات
کو سچ نہیں مان سکتا۔ اسلام کے خلاف جو دوامی جنگ جاری رہی ہے
اس کی بنا بالکل نئی مگر نہایت خطرناک صورت ہے کہ گورنمنٹ کے [illegible]
ملک میں اس مسئلہ کے متعلق وعظ کہنے کے لئے متعین ہو گئے اور بعض
مدبرین انگلستان بھی ان کے ہمزبان ہو گئے ہیں۔ مگر تاریخی صداقت
اس تبلیغی کام سے فنا نہیں ہو سکتی۔

میرے دوست ڈاکٹر سید محمود نے اس تبلیغ اشاعت کے کمزور اور
غیر موثر ہونے کو ثابت کیا ہے۔ انہوں نے جس مسئلہ کو اٹھایا ہے
اس کو ناقابل تردید شہادتوں اور خود انگریزی مورخین کے ایسے
اسناد سے جن کے خلاف زبان نہیں کھولی جا سکتی ثابت کیا ہے۔

ناظرین اس کتاب سے اسلام اور انگلستان کے تعلقات کی
تاریخی حیثیت کا صحیح اندازہ کر سکیں گے جو نہایت واضح اور صاف طور

سے دکھائی گئی ہے۔ مصنف کو زمانۂ حال کے نئے مورخین پر اس وجہ سے
فوقیت حاصل ہے کہ وہ اسلامی تاریخ کے اصل مواد پر دسترس رکھتے
ہیں۔ مسائل متنازعہ فیہ پر ایسے تشفی بخش اور عالمانہ طریقہ سے بحث کی گئی ہے کہ
غیر جانبدار شخص اس کو قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ غالباً بعض لوگ
اس کو ضرورت سے زیادہ تاریخی تصور کریں گے اور بعض یہ کہیں گے کہ
اس میں ایک [illegible] قسم کی بے صبری کا ذکر تک نہیں آیا۔ یہ اپنی اپنی
رائے ہے مگر اس کتاب کے مفید اور صحیح ہونے کے بارے میں دو رائیں
نہیں ہو سکتیں اس لئے امید ہے کہ عام لوگ کثرت سے اس کے
مطالعہ سے دلچسپی حاصل کریں گے اور مستفید ہوں گے۔

مظہر الحق

پٹنہ۔ صداقت آشرم

۲۸ اپریل ۱۹۲۱ء

انگلستان کے عہد و پیمان

جو شکست کئے گئے

ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین کر لینا چاہیئے کہ ہر گز ہمارے متحدین اس جنگ میں کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس سے ان کے مذہبی جذبات اور خیالات کو ٹھیس لگے۔ اسلام کے مقدس مقامات بے حرمتی سے محفوظ رہیں گے اور ان کی عزت و حرمت قائم رکھنے کی ہر قسم کی ممکن احتیاط کی جائے گی۔

اسلام کے مقدس دارالخلافت کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ ہم صرف ترکی وزراء سے لڑ رہے ہیں جو جرمنی کے زیر اثر کام کر رہے ہیں نہ کہ خلیفۃ المسلمین سے۔ برٹش گورنمنٹ نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ اپنے متحدین کی طرف سے ان تمام مواعید کی ذمہ داری لیتی ہے (خلاصہ اعلان سرکاری شائع کردہ گورنمنٹ ہند نومبر ۱۹۱۴ء جس کی اشاعت اعلان جنگ کے ساتھ سرکاری طور پر ہندوستان کے ہر قصبہ و قریہ میں کی گئی)۔

لارڈ ہارڈنگ نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں ۱۲۔ جنوری ۱۹۱۵ء کو فرمایا

"متحدین نے جزیرۃ العرب اور عراق کے اماکن مقدسہ کو حملہ سے

محفوظ رکھنے کے متعلق اعلان کیا ہے اور برٹش گورنمنٹ نے پہلے ہی اعلان کیا ہے کہ اگر کوئی ضرورت ہو تو وہ بیرونی حملہ آوروں کے خلاف اُن کی حفاظت کرنے کے لئے تیار ہے اور اُن کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچنے دے گی۔ گو واقعات کا رُخ کتنا ہی کیوں نہ بدلے مگر اس میں شک نہ ہوگا کہ مقامات مقدسہ کے معاملات میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کی جائے گی اور اسلام دُنیا کی بڑی طاقتوں پر شمار کیا جاویگا۔

۲۰ اپریل ۱۹۱۵ء کو لارڈ کرزن نے دار الامرا میں یہ تقریر کی:-

"مجھ کو اس کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں مارکوئس آف کریو کی اس رائے سے متفق ہوں کہ خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کو خود ہی طے کرنا چاہئے۔ لیکن ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ خلیفہ کے لئے یہی ضروری نہیں ہے کہ وہ صرف مسلمان ہو بلکہ یہ بھی ضرورت ہے کہ وہ ایسا مسلمان ہو جو کسی یورپین طاقت کے زیر اثر نہ ہو۔"

مسٹر لائڈ جارج نے ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو ایک تقریر میں فرمایا:-

"ہم اس غرض سے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ٹرکی کو اُس کے دار السلطنت یا تھریس سے یا ایشیائے کوچک کے زرخیز ملک سے جہاں کی اصل نسل ترک آباد ہیں محروم کر دیں۔"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب اوّل

خلافت کا تاریخی پہلو

مسئلہ خلافت نے اس وقت جو دردانگیز نظارہ تمام عالم کے سامنے
پیش کر دیا ہے اس سے متاثر ہو کر اور ایک مسلمان کی حیثیت سے
اپنا فرض سمجھ کر صرف اس امید موہوم پر کہ مسئلہ خلافت کے
متعلق جو چند غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اُن کو دور کر سکوں سطور
ذیل لکھنے کے لئے مجبور ہوا ہوں:-

خلافت کا مسئلہ گوناگوں دلچسپیوں سے لبریز ہے۔ اس کے متعلق
بہت کچھ اختلاف آرا ہے۔ اس کا تجزیہ کوئی آسان کام نہیں
ہے اس فرض کو آیندہ زمانہ کے اسلامی مورخین ہی بہت خوبی سے
انجام دے سکیں گے۔ بدقسمتی سے سیاسیات کے مصنفین کے
ہاتھوں میں پڑ کر اس مضمون کی مٹی خراب ہو گئی ہے۔ اگرچہ مصنفین

نے اپنے خاص عقائد اور خاص اصول کی تائید میں اس مسئلہ
میں جو متعصبانہ رائیں قائم کی ہیں وہ افسوسناک ہیں اس کی بدولت
اور خانۂ صداقت پر ناقابل افسوس زوال پیدا ہو گیا اور اس
مسئلہ کا حل تاریکی میں پڑ گیا چونکہ اس حل سے مسلمانانِ ہند اور
اُن کے اُن اعتقادات پر جو وہ اپنے بادشاہ کے ساتھ رکھتے ہیں خاص
طور پر اثر پڑتا ہے اس لئے غیر جانبداری اور وضاحت کے ساتھ
نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

سرکار ہند کے محکمہ اشاعت و تشہیر نے حال میں ایک رسالہ شائع
کیا ہے جس کا عنوان "مسئلہ خلافت پر دیانت دارانہ گفتگو" ہے اس
رسالہ میں مندرجہ ذیل بیان فن تاریخ کے ایک متعلم کو حیرت میں ڈال
دیتا ہے۔ رسالہ مذکور میں ہے کہ:-

"یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانانِ ہند کا سلطان ٹرکی کو خلیفہ
ماننا ایک نئی چیز ہے اور گذشتہ نصف صدی کی ایک جدت ہے جو
نتیجہ ہے سیاسی پان اسلامی تحریک کی ترقی کا۔ اور اس دعویٰ کی
کوئی تاریخی شہادت نہیں ہے کہ مسلمانانِ ہند کے لئے خلافت میں
سلطان ٹرکی کی دنیوی اطاعت کا مفہوم پوشیدہ ہے"

اگر میری معلومات صحیح ہیں تو مندرجہ بالا بیان اسلامی ہند

کی تاریخ کے ایک مشہور پروفیسر کے قلم سے نکلا ہے۔ اپنے ملک کی خدمت
کرنے کے جوش میں فاضل پروفیسر نے بظاہر تاریخی واقعات کو فراموش
کر دیا ہے۔

جس وقت ٹرکی کے ساتھ باضابطہ اعلان جنگ ہوا مسلمانانِ ہند کو
اس درجہ مشکل پیش آئی جو ناقابل بیان ہے۔ اس واقعہ نے مسلمانان ہند
کے ساتھ ان کی وفاداری کا سوال اور نیز یہ سوال کہ خلیفۃ المسلمین کے
ساتھ ان کا کیا رویہ ہونا چاہیئے نمایاں کر دیا۔ اس واقعہ سے [illegible]
کیا جا سکتا کہ دنیا کے اور ممالک کے مسلمانوں کی طرح مسلمانان ہند [illegible]
یہ محسوس کرتے ہیں کسی طرح کم نہیں ہیں کہ وہ خلیفۃ الاسلام سلطان
ٹرکی سے مذہباً روایتاً اور عقیدتاً بڑی مضبوطی سے منسلک ہیں۔ یہ رشتہ
جو وادیٔ گنگا کے ایک ساکن کو کنارہ باسفورس کے رہنے والے شخص
سے (جن میں سے کسی ایک نے دوسرے کو نہ کبھی دیکھا ہے اور نہ دیکھنے کی
امید ہے) منسلک کرتا ہے، ممکن ہے کہ ایک یورپین کی نظر میں عجیب آئے، اور
وہ اس کو دور از عقل سمجھے۔ لیکن حقیقتِ حال یوں ہی ہے۔
اور میرے خیال میں ہر عقل سلیم رکھنے والے شخص کی توجہ اس طرف
زیادہ سنجیدگی سے منعطف ہونی چاہیئے کہ بجائے تردید کی نظر سے
جس کے وہ اب تک عادی رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسے جذبہ کا

[illegible] ہے جو مسلمانوں کے روحانی تفوقات کے لئے لابدی ہے
[illegible] سیاسی شامی اقوام کے (جن میں پہلے پہل سلطنت ظاہر ہوا)
اکثر مذہبی جوش میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ شامیوں کا مذہب
شاید تہذیب کے طالب علم کا پہلا خیال اپنی طرف مبذول کراتا ہے
[illegible] مذہبی احساس اور دوسرے مواقع پر ایک عنصر غالب رہا ہے
اور خصوصاً ایسی جگہ جہاں وطنیت کا وجود پایا جاتا ہو جیسا کہ ملک
ہندوستان میں۔ مگر شام میں یہ عنصر غالب اپنی حد کو پہنچ گیا ہے۔

شہنشاہیت کے حقیقی آغاز کا پتہ شامی النسل قوموں کے خصائل
و قوانین سے لگایا جا سکتا ہے جو مذہبی تقدس اور حکمرانی کو لازم و
ملزوم سمجھتے تھے۔ انفرادیت کا غلبہ شامی النسل قوموں میں بہت
زیادہ ہے۔ لیکن حسیات مذہبی و روحانی کے سامنے انفرادیت سر تسلیم
خم کر دیتی ہے۔ اصول انتخاب کسی نہ کسی صورت میں شامی النسل
قوموں کے درمیان ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اور ایک مقدس ملکی قانون
کی طرح مانا گیا ہے۔ اس انتخاب کے ساتھ ہمیشہ ایک قسم کا مذہبی اقتدار
شامل ہوا کرتا تھا۔ بہت قدیم ایام میں ادوم[1] کے بادشاہ منتخب شدہ
حکمران نظر آتے ہیں۔

---

[1] Edom

اہالیٔ فنیقیا (جن میں اہل قرطاجنہ بھی شامل ہیں) صوبۂ اسیائے کے کثیر اقسام مختلف پیش کرتے ہیں جن کو دیکھ کر قدیم یونان کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ ان لوگوں میں خالص حب الوطنی کا جذبہ اپنے ملکی معنی میں غالباً اتنی قوت کے ساتھ موجود نہ تھا۔ لیکن رومۃ الکبریٰ کے خلاف اہل فنیقیا کی جنگ جس میں قرطاجنہ تباہ ہوا اور اسکندر کے خلاف ٹائر کی ہلاکت آمیز کشمکش سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس احساس سے بالکل مبرا نہ تھے اگرچہ مؤخر الذکر واقعہ میں جذبات مذہبی کا بھی کچھ دخل تھا لیکن پھر بھی یہ کون کہہ سکتا ہے کہ میکابیس کی فوجوں کی بہ نسبت ہراتشن کے بہرو آزماؤں نے انسانیت کی زیادہ خدمت کی؟

اسلام نے عربوں کے عادات و خصائل میں بہت بڑے تغیرات پیدا کئے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے جوش مذہبی کی قومی خصوصیت کو اور زیادہ تیز کر دیا۔ اس سے پیشتر کبھی عربوں کا کوئی قومی مذہب نہ تھا۔ آنحضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم ان کے لئے قومی مذہب لائے اور اپنے پیرووں کو ایک ایسے سیاسی و مذہبی رشتۂ اتحاد میں جکڑ دیا جس کی یکجہتی اور مضبوطی کو زمانہ اور بعد بھی کم کرتا نظر نہیں آتا۔

۱	Pheuicians	۲	Carthagians
۳	Tyre	۴	Meaccalius

اسلام نے عربوں کے معاشرتی اور اخلاقی اور سیاسی حالات کے سدھارنے میں بہت زیادہ حصہ لیا۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم صرف فرقہ بندی اور قبیلہ کی طرفداری کے خیالات کو اتحادِ قومی کے جذبات سے تبدیل کردینے میں ہی کامیاب نہیں ہوئے بلکہ غیر عرب مسلمانوں مثلاً حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت بلال حبشیؓ کے ساتھ عمدہ سلوک کرکے عمل اور اصول دونوں ذرائع سے مساوات اور یکجہتی قائم کرنے کی کوشش کی۔

مساوات اسلامی کی یہ لہر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خلفائے راشدین کے زمانہ میں ایسی سُرعت کے ساتھ دوڑ گئی جس کی نظیر عالم میں نہیں ملتی۔

مساوات کا یہ اصول ساتویں صدی عیسوی کے اختتام کے وقت بحر اطلانطیق سے دریائے سندھ اور بحیرہ خضر سے وادیٔ نیل تک پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔ روحی فداک پیغمبر اسلام کا مدعا تمام مسلمانوں میں مساوات قائم کرنا تھا چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔ (ایمان[1] والے آپس میں بھائی ہیں اس لئے اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح و آشتی قائم کرو)۔ دوسری جگہ ہے[2] خدا کی نظر میں تم میں سب سے

---

[1] ان المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم۔

[2] ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

زیادہ شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہے۔ لیکن مندرجہ ذیل حدیث اس سے بھی زیادہ بیّن طور پر نسلی غرور اور خاندانی تکبر کی مخالفت کرتی ہے۔

"اے انسانو! خدا نے تم سے ایّام جاہلیت کا تکبر اور قدیم نسلی غرور چھین لیا ہے۔ ایک عرب کو کسی غیر عرب پر سوائے خوف خدا کی صفت کے اور کوئی دوسری وجہ امتیاز حاصل نہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم خود خاک کا بنا ہوا تھا"[۱]۔ جس وقت سے پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ایک آزاد سیاسی جماعت کے سردار کی حیثیت سے استقامت اختیار کی اسلام ایک سیاسی جماعت کا مذہب قرار پایا۔ چنانچہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مومنوں کو اپنے مذہبی احکامات قبول کرنے کے لئے بلایا تو ساتھ ہی ساتھ آپ نے ایک بادشاہ کی حیثیت سے انہیں قوانین بھی عطا کئے۔ پروفیسر نولڈیکے کہتا ہے کہ "وہ ان کے امام تھے۔ نماز کے وقت ان کی امامت کرتے تھے۔ اور وہی ان کے امیر تھے اور وہی قاضی اور وہی حاکم تھے"۔ اس طرح مادی اور روحانی ہر دو اقتدارات ایک ذات میں متحد ہو گئے ۔۔۔ اسلام

[۱] لا فضل لعربی علی عجمی ولا عجمی علی عربی کلکم ابناء آدم۔

ابتدا ہی سے صرف ایک مذہب کی حیثیت ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ
اس میں قومیت کی صلاحیت بھی تھی۔ مسلمانوں کو بتلایا گیا کہ وہ
پیغمبر خدا کی اطاعت کریں (۱) اور (نیز) اُن لوگوں کی جو اُن کے حاکم ہیں
اس حکم سے ہم کو یہ پتہ چلتا ہے کہ دُنیوی حکومت کے دائرے میں
اور لوگ بھی شامل تھے۔ اب سے چند برس قبل یہ بات خیال میں
بھی نہیں آسکتی تھی کہ عرب جیسے مختلف النسل لوگ ایک سردار کی
رہبری میں کام کر سکیں گے۔ آنحضرت صلعم کو حامل وحی تسلیم کرنے
کے بعد فطرتاً اس بات کی ضرورت پڑی کہ حضور کا ایک خلیفہ یعنی
نائب رسولؐ ہونا چاہئیے جو سب باتوں میں سوائے منصب رسالت
کے آپ کی قائم مقامی کر سکے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ ضرورت پیش آئی
کہ آپ کا جانشین منتخب کیا جائے جو آپ کی جگہ پر مسلمانوں کی امامت
کرے۔ یہ بات نہ تھی کہ خلافت کے مسئلہ کا خیال آپ کے دماغ میں
نہ آیا ہو۔ بلکہ آنحضرتؐ نے صرف اس خیال سے کہ مسلمان خود اپنا امام
منتخب کریں کسی شخص کو خود نامزد نہیں فرمایا۔ ایک حدیث ہے کہ بوڑھے
عامر بن طفیل آنحضرتؐ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا "اگر میں
اسلام قبول کر لوں تو میرا مرتبہ کیا ہوگا؟ کیا آپ مجھے اپنے بعد امامت

عطا فرماویں گے" آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا میرے بعد مسلمانوں کی امامت کے فیصلہ کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں "۔

عام طور پر مسلمان علماء و مورخین منصب خلافت کی چار مختلف صورتیں اور اس کی تاریخ کے چار مختلف دور قرار دیتے ہیں۔

۳۲ء سے ۶۶۱ء تک

پہلا تاریخی دور ایک خالص مذہبی حکمرانی کا زمانہ تھا جس میں خلیفہ ایک مقدس مذہبی سردار اور ساتھ ہی ساتھ بادشاہ بھی ہوا کرتا تھا۔ یہ دور صرف تیس سال تک قائم رہا اور اس میں چار خلفاء حضرت ابو بکر صدیق حضرت عمر فاروق۔ حضرت عثمان غنی اور حضرت علی شیر خدا ہوئے جنکے مدارج آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام میں بہت ہی بلند تھے۔ یہ خلفائے راشدین کہلاتے ہیں۔

اسلام کا یہ مقدس ترین تاریخی زمانہ تھا جو حکومت کے تخیل کے اعلیٰ ترین دور کا نمونہ پیش کرتا تھا۔ تاریخ خلافت میں یہ دور بہت مختصر لیکن بہت اہم ہے۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے انتقال (۸ جون ۶۳۲ء) کے بعد فوراً ہی آپکے تمام معزز ترین اصحاب آپکے جانشین کو منتخب کرنے کے لئے جمع ہوئے سب کی نظر انتخاب حضرت ابو بکر صدیق پر پڑی جو آنحضرت کے یار غار تھے۔ خلافت کے اس دور میں احکام مذہبی کی بہت

سختی کے ساتھ تعمیل کی جاتی تھی۔ خلیفہ ایک معمولی شخص کی طرح سیدھی سادھی زندگی بسر کرتا تھا۔ شاہزادے اور امرا غیر ملکی یا عرب نومسلم یا قیدی جب امیر المومنین کے دیکھنے کے شوق میں مدینہ آتے تھے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے کہ ایک شخص کو جو کسی طرح بھی مدینہ کے دوسرے لوگوں سے بظاہر کوئی مختلف حیثیت نہیں رکھتا تھا امیر المومنین کہا جاتا ہے۔ جس کی نسبت ہم سنتے آتے ہیں کہ زمین پر ایک بوریہ بچھا کر سوتا تھا۔ سادہ سے سادہ لباس پہنتا تھا اور محض معمولی غذا کھاتا تھا۔ چنانچہ انھیں خلفا میں سے ایک خلیفہ نے ایک مرتبہ اُن لذائذ دنیوی کا ذکر کرتے ہوئے جس کو وہ عمداً چھوڑ چکے تھے یہ فرمایا تھا کہ اگر میں چاہوں تو میرے لئے نفیس ترین شہد اور ملائم ترین جو کی روٹی بہت آسانی کے ساتھ مہیا ہو سکتی ہے۔

یہ ہے وہ نصب العین جس کی نسبت قرونِ اُخریٰ کے ہر سچے اور اتقا پسند مسلمان کی رغبت ہوتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ وہی زمانہ پھر عود کر آئے اس کے لئے مسلمانوں کو حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور کا انتظار ہے جو خلافت کے گزشتہ شان و شکوہ کی پھر تجدید کرینگے اور سچا دین پھیلائینگے اور دُنیا کو عدل و انصاف سے معمور کر دیں گے۔

۶۶۱ء سے ۱۲۵۸ء تک

دوسرا دور جس کی مدت قیام چھ سو سال ہے عربی بادشاہت کا زمانہ ہے جس میں خلافت نے خاندانی دنیوی و سیاسی حکومت کی صورت اختیار کر لی۔ اس دور میں خلیفہ کے لئے عالم شریعت اور متقی ہونا ضروری نہ تھا۔ حضرت معاویہ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ خلفائے بنو امیہ کا دور اس دور سے جس کا ہم ابھی تذکرہ کر چکے ہیں بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ اس دور میں حضرت عمر کی سی سادگی اور حضرت علی کا سا تقویٰ باقی نہ رہا تھا۔ خلفائے بنو امیہ غیر ملکی مسلمانوں کو اپنے برابر حقوق نہ دیتے تھے۔ وہ مناصب استحقاق جن کے تمام سچے مسلمان برابر طور پر دعویدار ہو سکتے تھے انہیں عطا نہیں کئے جاتے تھے اور اسی طرح اصول اسلام کی صریح خلاف ورزی کی جاتی تھی۔ انکے زوال کے ساتھ ہی عربوں کا ایک حاکم قوم کی حیثیت سے خاتمہ ہو گیا اور انکی جگہ پہلے ایرانیوں نے اور پھر اسکے بعد ترکوں نے لی۔ عربوں نے بہت بڑی ترقی حاصل کی اور ایک زمانہ تک تاریخ عالم میں ان کا بہت بڑا حصہ رہا کیونکہ ایک اعلیٰ مقصد جمہوریت و مساوات کا ان کے پیش نظر تھا جو ان میں تحریک پیدا کرتا تھا۔ لیکن جب انہوں نے اس اعلیٰ مقصد کو کھو دیا اور صرف حکمرانی کے خیال سے حکومت کے طلبگار ہوئے تو وہی اعلیٰ مقصد

جس سے وہ کبھی طاقت حاصل کرتے تھے۔ ان کی تباہی کا باعث ہوا
خلافت عباسیہ کے دور میں ابتداً ایرانیوں کا اور پھر آخر میں ترکوں
کا غلبہ رہا۔ چونکہ عباسیوں کو ایرانی مسلمانوں کی مدد کے ذریعے سے
خلافت ملی اس لئے وزرا اور ارکینِ حکومت کے انتخاب کے وقت وہ
اس بات کو کبھی نہ بھولے کہ ان کی قوت کے اصلی باعث غیر عرب
مسلمان تھے۔ باوجود کثیر عیوب و نقائص کے عباسیہ خاندان اعلیٰ صفات
سے لبریز اور فیاضانہ اوصاف سے معمور تھا سائنس کی قدردانی اُن کا
حصہ تھا۔ تمدن و تہذیب کے دلدادہ تھے۔ فیاضی میں بے مثل تھے۔ اُنکے
عہد میں آزادیٔ ضمیر کی عزت کی جاتی تھی۔ سرحدوں کی دلیرانہ مدافعت و
محافظت ہوتی تھی۔ مختصر یہ کہ دُنیا میں فارغ البالی تھی یہ وہ زمانہ تھا
جبکہ تہذیب سائنس اور تمدن مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے جبکہ یورپ
اپنے زمانہ متوسطہ میں ظلمت و بربریت میں آلودہ تھا بقول پروفیسر براؤن
یورپ فارس کے ابن سینا اور عرب کے ابن رشد کے فلسفہ طب اور ریاضی
کی روشنی سے مستفید ہونے میں عار نہیں سمجھتا تھا۔

سنہ ۱۲۶۱ع سے سنہ ۱۵۱۷ع تک

تیسرا دور جس کی مدت قیام تقریباً تین سو سال تھی وہ زمانہ تھا جبکہ سیاسی
اقتدار کا خاتمہ ہو چکا تھا اور خلافت کے شاہانہ حقوق سلب ہو چکے تھے

اس وقت اسلام کا سیاسی اور دنیوی اقتدار جس کا مسلسل طور پر اس زمانہ تک جاری وساری ہوتا چلا آتا تھا نظری طور پر فرض کر لیا گیا ہے۔ مصر کے مملوک سلطانوں اور دیگر مسلمان حکمرانوں کے قبضہ میں تھا۔ بیبرس[۱] نے جب سنا کہ شام میں خاندان عباسیہ کا ایک وارث زندہ ہے تو اس نے تجویز سوچی کہ اسے خلیفۃ المسلمین بنا کر خود اس کی زبان سے روحانی برکت اور سلطان کا خطاب حاصل کرے۔ چنانچہ خاندان عباسیہ کا یہ جانشین جس کا نام احمد طاہر تھا قاہرہ لایا گیا۔ اس کی آمد پر سلطان مع اپنے ارکین سلطنت کے بڑے کروفر کے ساتھ استقبال کے لئے گیا۔ قاہرہ پہنچ کر احمد طاہر نے منبر پر ایک خطبہ پڑھا۔ اپنی خلافت کا اعلان کر کے اپنا لقب مستنصر باللہ رکھا۔ بیبرس کو شاہانہ خطاب عطا کیا اور دین کی خاطر جنگ کرنے کا فرض اس پر عاید کیا مستنصر مغلوں کے خلاف ایک جنگ میں سنہ ۱۲۶۲ء میں قتل ہوا۔ اس کے مرنے پر بیبرس نے اس خاندان کے ایک دوسرے نوجوان شہزادہ کو خلیفہ بنا کر تخت پر بٹھایا اور اس کی وفاداری کا حلف اٹھایا۔

آخری دور خلافت عثمانیہ کا ہے۔ سنہ ۱۵۱۷ء میں سلیم اول نے مصر کو جو اس وقت مملوک سلطان کے قبضہ میں تھا فتح کیا۔ اور خاندانِ عباسیہ کے آخری جانشین متوکل ابن عمر الحاکم سے سلطان السلاطین حاکم الحواکم مالک البحرین والبرین

۱؎ Baibars

حامیٔ دین خلیفۂ رسول اللہ امیر المومنین وغیرہ وغیرہ لقب کے ساتھ مرتبۂ خلافت حاصل کیا۔ خلفائے عثمانیہ کا یہ خطاب آجتک محفوظ چلا آرہا ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ وہی لوگ جنہوں نے اسلامی تمدن کو تباہ کیا اس مذہب کے محافظ بھے۔ جس شخص نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ کیا تھا وہ سلیم کا ہموطن تھا یہ تباہی وہ تباہی تھی جس نے اسلام کو ایسا سیاسی اور معاشرتی صدمہ پہنچایا کہ وہ پھر کبھی سنبھل نہ سکا۔ مغلوں کی لائی ہوئی اس تباہی بربادی کی مختصر الفاظ میں اس طرح تشریح کی گئی ہے:۔

"آمدند، کندند و سوختند و کشتند و بردند و رفتند"

ہلاکو کے ہاتھوں "باغ داد" (بغداد) کی تباہی و بربادی سے جو اخلاقی و دماغی انجماد پیدا ہو گیا تھا وہ اگرچہ زائل نہ ہو سکا لیکن ہلاکو خاں کی اولاد اور اُس کے ہم قوموں نے اسلام لانے کے بعد ہمیشہ اس مذہب کی محافظت اور مدافعت میں جنگ کی۔ سلطان ٹرکی کے پاس منصب خلافت کے حقدار ہونے کے متعلق ایک سے زیادہ وجوہ موجود تھے۔ وہ سلطان محمد فاتح کا پوتا تھا جس نے مشرقی روم کی حکومت کو مکمل طور پر تباہ کر کے اسکی جگہ پر اسلام کی حکومت قائم کر دی تھی وہ اپنے عصر کا سب سے زیادہ طاقتور مسلمان بادشاہ تھا سب سے بڑھ کر یہ کہ خلافت عباسیہ کے آخری جانشین سے مرتبہ خلافت حاصل کرنیکی وجہ سے اس کا حق شرعی اور قانونی طور پر قائم ہو گیا تھا۔ جب سلیم نے خلیفہ کا

لقب اختیار کیا تو علمائے شریعت کی جماعت میں اس کے حق کے متعلق اختلاف آرا پیدا ہو گیا لیکن آخر کئی سال کے مباحثہ اور رد و کد کے بعد اس کی جانشینی تسلیم کر لی گئی اور مکہ معظمہ میں اسے جائز خلیفہ مانا گیا۔ اس کے بعد سے پھر کبھی کسی نے سلاطین عثمانیہ کے حق خلافت پر اعتراضات یا تنازعات پیدا نہیں کئے۔

آل عثمان کا حق خلافت مندرجہ ذیل دعاوی پر مبنی ہے

۱۔ نامزدگی جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے۔ خاندان عباسیہ کے ایک جانشیں متوکل نے سلیم کو خلیفہ نامزد کیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں۔ فرقۂ اہل سنت والجماعت نے اسے جائز تسلیم کیا اور اس کی نظیر میں یہ واقعہ پیش کیا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے انتقال کے وقت حضرت عمرؓ کو اپنا جانشیں خلیفہ نامزد کیا تھا۔ متوکل چونکہ خاندان عباسیہ کا آخری جانشیں تھا اور مصر میں اُس کی خلافت مسلم طور پر مانی جا چکی تھی۔ اس لئے اُسے پورا شرعی اور قانونی حق حاصل تھا کہ سب سے طاقتور مسلمان بادشاہ کو منصب خلافت حوالہ کر کے خود علیحدہ ہو جائے۔

۲۔ انتخاب سلیم کے خاندان کا حق خلافت صرف متوکل کی نامزدگی ہی پر مبنی نہیں بلکہ اس کی نامزدگی کو تمام اسلامی دنیا نے بھی جائز تسلیم کیا ہے سلیم نے اس امر میں اہل العقد کی شرعی و قانونی منظوری حاصل کی لیکن

پیش ہو گئی کہ جماعت اہل السنت مدینہ سے منتقل ہو کر دمشق۔ دمشق سے
بغداد اور پھر بغداد سے قاہرہ چلی گئی تھی۔ اس لئے پھر ایک مرتبہ اور
اسے حرکت دی پھر قاہرہ سے قسطنطنیہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔ سلیم نے قاہرہ
میں جامع الازہر کے علماء اور پھر مسجد ایوب میں ترکی علماء کی مجلس قائم کی
جنہوں نے اسے خلیفہ تسلیم کیا۔ ایک طریقہ انتخاب اس وقت بھی قسطنطنیہ
میں مروج ہے۔ ہر سلطان اپنی تخت نشینی کے وقت اپنی منظوری حاصل کرتا
ہے اور جامع ایوب میں شیخ الاسلام کے ہاتھوں سے حضرت علیؓ کی
مقدس تلوار لیتا ہے تاکہ اس کا دعویٰ خلافت مکمل ہو جائے۔

۳۔ مقامات مقدسہ کی حفاظت وسرپرستی (مکہ۔ مدینہ۔ کربلا۔ بیت المقدس و دیگر مقامات) از منہ سابقہ میں بیت اللہ (مکہ) کی حفاظت
کے لئے اکثر لڑائیاں لڑی گئیں۔ موجودہ زمانہ میں سلطان ترکی
ہی ایک ایسا مسلمان بادشاہ تھا جس کی مضبوط طاقت بیت اللہ
کو محفوظ رکھ سکتی تھی۔ اور اسی وجہ سے اُس کو خادم حرمین الشریفین
کہا جاتا ہے۔

۴۔ آزاد و مختار اسلامی حکومت خلافت کے لئے یہ ایک ضروری شرط
ہے اور شریعت اسلامیہ نے اس پر بہت زور دیا ہے اور وہ شخص جو ایک
خود مختار بادشاہ نہیں ہے مرتبہ خلافت کا حقیقی و جائز دعویدار نہیں

ہو سکتا۔

۵۔ مقدس نشانات و یادگاروں کا قبضہ | موجودہ زمانہ میں اس دلیل کا عام مسلمانوں پر اتنا زبردست اور گہرا اثر ہے کہ اس میں انکار کی مطلق گنجائش نہیں۔ یہ یادگار و نشانات رسول مقبول صلعم کے پیرہن مبارک۔ حضرت علی کی تلوار اور علم اور چند دیگر اشیاء پر مشتمل ہے عام طور پر تمام مسلمان اسے تسلیم کرتے ہیں کہ ۱۲۵۸ء میں تباہی بغداد کے بعد یہ مقدس نشانات قاہرہ لائے گئے اور پھر وہاں سے قسطنطنیہ پہنچے۔

۶۔ عام مسلمانوں کی رضامندی۔ اجماع الامۃ | یہ سب سے اہم شرط ہے۔ اگر کوئی مسلمان حکمراں بھی مقامات مقدسہ پر قبضہ کرلے تو اس وقت تک وہ خلیفہ نہیں مانا جاسکتا جب تک کہ عام مسلمانوں کا اکثر حصہ اُسے منظور نہ کرلے۔ جیسا کہ دسویں صدی میں فرماطین اور اٹھارہویں صدی میں وہابیوں کے ساتھ پیش آیا۔ چنانچہ یہ فرض کرلینا غلطی ہے کہ سلطان ٹرکی صرف اس وجہ سے خلیفہ ہے کہ وہ حرمین شریفین کا خادم ہے اور یہ کہ اماکن مقدسہ اُن کی حفاظت میں رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود شریف مکہ بھی آج تک سلطان کو شرعی طور پر خلیفہ تسلیم کرتا ہے۔

۷۔ استحقاق بزور شمشیر | یعنی حقوق سلطنت کا واقعی اور حقیقی قبضہ

دلیل یہ پیش کی جاتی تھی کہ چونکہ خلافت کا قیام ضروری ہے اس لئے یہ
بھی ضروری ہے کہ وہ شخص جو ان حقوق و خطابات پر واقعی اور حقیقی
قبضہ رکھتا ہو شرعی طور پر اُس وقت تک خلیفہ تسلیم کیا جائے
جبتک کہ کوئی ایسا دوسرا دعویدار خلافت اس سے بہتر دعاوی کے
ساتھ ظاہر نہ ہو۔ اُس وقت سے جب کہ سلیم نے مسندِ خلافت پر
قبضہ کیا۔ آج تک کسی شخص نے اس کی کامل مخالفت نہیں کی جس
وقت سے کہ خاندان عباسیہ کے آخری جانشین نے اپنے حقوق خلافت
سلطان سلیم کے حوالہ کئے اُس وقت سے آج تک کوئی دوسرا شخص
ان حقوق کا حقیقی دعویدار نہیں پایا گیا۔ اس کی تائید میں معاویہ
اور ابوالعباس کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ نظریات سے واقعات
سو گنے قابلِ وثوق ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ صدیوں تک ترکوں
نے اسلام کی خاطر جنگ کی ہے اور مسلمانوں کے لئے مایۂ ناز رہے ہیں
بغیر ترک کی فوجی طاقت کے اسلام کبھی قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ جبکہ بقیہ
اسلامی دُنیا بے پرواہ اور خوابِ غفلت میں سرشار تھی یا مسلمان مغربی
دست اندازیوں کے روکنے کی کافی قوت نہ رکھتے تھے۔ اُس وقت
یہی تُرک تھے جنہوں نے ان حملوں کو روکنے کے لئے اپنی ہڈیوں کی
دیوار کھڑی کر دی تھی۔ خاندان عثمانیہ کی بدولت اسلام اپنے لئے نیز

دیگر ایشیائی تمدن و تہذیب کے لئے ایک مرتبہ پھر عیسائیت کے خلاف ایک پشتہ سنگ ثابت ہوا۔ قسطنطنیہ کی فتح اور حکومت روم کی مکمل تباہی کا پرانا خواب انہیں کے ذریعہ سے پورا ہوا۔ خدا کی راہ میں لڑنا مسلمان کے لئے ایک ایسا کام ہے جو ہر شخص کے لئے قابل رشک ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے۔ "ان لوگوں کو جو خدا کی راہ میں مارے جاتے ہیں بہت بڑا اجر ملے گا" چنانچہ ترکوں نے راہ حق میں جان دینے کا بیڑا اٹھایا۔ اس وجہ سے وہ خدا کے خادم اور ان کا بادشاہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا امیر مانا جاتا ہے۔ یہ ایمان و مذہب کا اعتقاد ہے اور عقل کے لئے اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ کوئی شخص موجودہ الحاد و لامذہبیا کے نقطۂ نگاہ کے باوجود بھی اس واقعہ سے انکار نہیں کر سکتا کہ ترک اسلام کے سپر بلکہ اس سے بھی زیادہ ثابت ہوئے ہیں یعنی یہ کہ انہوں نے ایشیا کی روحانی تہذیب کو یورپ کے مادی ہوسناکیوں کے حملوں سے بچایا۔ اس طرح ہم نے دیکھ لیا کہ قانون خلافت اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود اسلام نیز یہ کہ مذہبی تقدس ہمیشہ اس کے ساتھ رہا۔ یہ اسلام کی تاریخ سے وابستہ ہے اور اسے کسی طرح علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے جب تک اسلام کی زندگی باقی ہے یہ اس کے رگ وپے میں سرائت کئے ہوئے رہیگا۔

باب دوم

ملکی پہلو

لفظ خلیفہ کا مادہ "خلف" ہے جس کے معنی "پیچھے چھوڑنے"
کے ہیں۔ شرعی قانونی محاورہ میں اس کے معنی پیغمبر اسلام کا
جانشین ہیں جو اسلام کی روحانی و سیاسی طاقتوں کے وارث قرار پائے
گئے ہیں۔ جب شریعت اسلامیہ منضبط کی گئی تھی تو بادشاہی شخصیت
کا کوئی وجود تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ اوائل زمانہ کے خلفاء اور ان کے
اقتدار کا مقابلہ قدیم رومن جمہوریہ کے سرداروں سے کیا جاسکتا ہو
کیونکہ ہر ایک خلیفہ یا جانشین پیغمبر اسلام رائے عامہ کے مطابق
عوام کی جماعت سے منتخب کیا جاسکتا تھا۔ شریعت اسلام کی رو سے
خلیفہ یا جانشین پیغمبر و امیر المومنین و صحابی ہونے کے باعث اجتہاد و
اختراع کے معاملات میں تنہا شرعی سند ہے۔ اُسے اختیار ہے کہ وہ دلائل
و احکام قرآنیہ کے مطابق ہر ایک قسم کی سیاسی۔ قانونی اور معاشرتی
اصلاح عمل میں لائے۔ پہلے چار خلفائے اسلام کو قوانین سازی کے
معاملہ میں مکمل خود مختارانہ اقتدار حاصل تھا۔ اسلام کے قوانین میں جو

اس وقت تک نامکمل حالت میں تھے اُنھوں نے اپنی خواہش کے مطابق ترمیم کی۔ وہ قوانین مذہبی کے مطابق صرف انتظام و حکمرانی ہی نہیں کرتے بلکہ وہ اسکے مصنف ہونیکے ساتھ ہی ساتھ اُن کے مترجم و شارح بھی تھے۔ سلطان ٹرکی خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ہر اُس قانون میں جو موجودہ حالت میں مناسب و قابل عمل نہیں۔ دلائل و احکام قرآنیہ کے مطابق ترمیم و تنسیخ کر سکتا ہے جیساکہ سلطان المعظم نے فرقہ حنیفہ کے اُن قوانین کی مخالفت میں جن کا تعلق انتظام سلطنت سے تھا نئے قوانین شائع کئے تھے۔ چند دیگر سلاطین نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ سلطان المعظم کو اس معاملہ میں حنفی علماء کی منظوری و رضامندی بھی حاصل ہو گئی تھی۔ خلیفہ کا اقتدار کسی خاص سرحد کے اندر محدود نہیں بلکہ تمام مسلمانوں پر خواہ وہ کہیں رہتے ہوں جاری و ساری ہے اس لئے اگر اس کے احکام و قوانین تمام مسلمانوں کے لئے مقصود ہیں تو اُس کی پیروی ہر مسلمان پر واجب ہے جبکہ شریعت اسلامیہ میں خلیفہ کا اقتدار اس قدر وسیع ہے تو پھر تمام مسلمان خواہ وہ کسی دوسرے حکمراں کے ماتحت کیوں نہ ہوں ہر ایک قسم کے معاملات یہاں تک کہ سیاسیات میں بھی خلیفہ کے احکام و قوانین کے ماتحت ہیں۔ کیونکہ اسلام میں سیاسیات اور مذہب دونوں متحد اور آپس میں ملے جُلے ہیں۔ خلافت کے ساتھ سیاسی اور دنیوی وفاداری اور فرماں برداری بھی شرط ہے۔ کیونکہ خلیفہ

پیغمبر اسلام کی صرف مذہبی پیشوائی کا ہی نہیں بلکہ اُن کے سیاسی اقتدار کا بھی وارث ہے۔ پیغمبر صلعم نے اپنے میں بادشاہی اور مذہبی و روحانی پیشوائی کے دو مناصب کو متحد کردیا تھا۔ چنانچہ اسلامی حکمرانی کی یہ صورت اس وقت تک اگر خدا کا نائب نہیں تو کم سے کم پیغمبر اسلام کا سیاسی اور دُنیاوی جانشین ضرور مانا جاتا ہے۔ خلیفہ کا اقتدار صرف حکومت کے سیاسی معاملات ہی پر نہیں۔ بلکہ مذہبی اور معاشرتی اور مُلکی امور پر بھی رہا ہے جس طرح اُسے سرحدوں کی حفاظت کرنی لازمی ہے۔ اسی طرح مذہب کا تحفظ بھی اس کا فرض ہے۔ اس لئے آئینِ اسلامیہ کے مطابق خلیفہ اعلیٰ ترین حکمراں افسر ہے۔ مختصر الفاظ میں وہ اسلام کی تنظیم کرتا ہے اور احکام جاری کرتا ہے۔ یہ احکام عام مسلمانوں کی رضامندی سے طے پائے ہیں جن کا اظہار فوری طور پر علماء کے ذریعہ اور آخیر میں بلاواسطہ عوام کے ذریعہ ہوتا ہے۔ زمانہ حال کا ایک بہت بڑا ماہر سیاست والٹر بیگاٹ کہتا ہے "یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ انسان میں اطاعت شعاری کا مادہ کس طریقے سے پیدا کرنا چاہئے اور اس اطاعت شعاری سے کام لینا کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس اطاعت شعاری کے حاصل کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ یگانگت پیدا کی جائے۔ اتحاد نہیں بلکہ مذہب اور حکومت میں یکسانیت پیدا کرنا ضروری ہے۔"

ڈاکٹر آرنلڈ ہمیشہ یہ تعلیم دیتے رہے کہ یہ یگانگت موجودہ گمراہ دنیا کے لئے خضر راہ ہی۔

بیگاٹ کہتا ہے کہ طاقت و اقتدار کی کوئی تقسیم خطرہ بلکہ تباہی سے خالی نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئیے کہ مذہبی جماعت (طبقۂ علماء) تو کچھ تعلیم دیتی ہو لیکن بادشاہ کچھ الگ حکم صادر کرتا ہو۔ دونوں کو ایک ہی بات کہنی چاہئیے۔ کیونکہ دونوں ایک ہی ہیں۔ عقوبت آخرت اور سزائے قانونی کے فرق کو ہرگز زیادہ بیں اور روشن نہ کرنا چاہئیے۔ بالیقین قدمائے یونان و روما اس کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ جیساکہ اس وقت کے ایک زبردست ماہر سیاست کا خیال ہے۔ اسلام نے اس کا وعظ صدیوں تک کہا ہے اور اس پر ہمیشہ عامل رہا ہے۔ ہمارا مفہوم غلط نہ سمجھ لیا جائے خلیفہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ امام بھی ہو۔ وہ اوروں کی طرح گناہ کا مرتکب ہوسکتا ہے اور اُسے بھی اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کی طرح اُسی شرعی قانون کا پابند ہونا ضروری ہی۔ اکثر مسلمان علما مثلاً ابواسحاق طبری کے خود ذات پاک نبوی کو گناہ کی کمزوری سے منزّہ و مبّرا نہیں سمجھتے۔ آنحضرت صلّے اللہ علیہ وسلّم نے ایک قوم کی قوم کو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنالیا۔ لیکن ان سے زیادہ کسی نے انکساری نہیں کی۔ آپ نے بالاعلان فرمایا کہ تم ہی جیسا میں بھی ایک انسان

ہوں اور بالکل تمہاری ہی طرح میرے گناہوں کی معافی بھی خدائے برتر کے ترحم پر موقوف ہے۔

الماوردی جو خلیفہ القادر عباسی کے زمانہ میں سب سے پہلا فقیہہ گزرا ہی کہتا ہے کہ خلیفہ کوئی ممتاز درجہ نہیں رکھتا ہے۔ اصولاً وہ سلطنت کے دوسرے ارکان کی مثل ہے ایک معمولی عدالت میں اس پہ مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔

خلیفۂ دوئم پر ایک مرتبہ مالِ غنیمت سے ایک بڑا حصّہ لینے کا الزام عائد ہوا تھا اور اُن کو اپنی صفائی قوم کے سامنے پیش کرنی پڑی تھی۔ انصاف کے معاملہ میں خلیفہ کی کارروائیوں پر ہر مسلمان نکتہ چینی کر سکتا ہے خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کو ایک بار ایک بڑھیا نے سختی سے ٹوکا تھا اور کہا تھا کہ قرآن پاک کی ایک آیت کا مطلب جو اُنھوں نے بیان کیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ فاروق اعظم نے اس کے دلائل کو غور کے ساتھ سُنا اور اسی کے کہنے کے مطابق فیصلہ کیا۔ الماوردی نے مسلمانوں کی جماعت کو دو حصّہ میں بانٹ دیا ہے۔

نمبر ۱۔ انتخاب کرنے والے نمبر ۲ انتخاب کئے جانے والے۔

انتخاب کرنے والوں کی تعریف حسب ذیل ہے۔

(۱) نیکنام ہو۔ (۲) رموزِ سلطنت سے آگاہ ہو (۳) ژرف نگاہ

ہو اور قوت فیصلہ رکھتا ہو یہاں پر یہ ظاہر کرنا بے موقع نہ ہوگا کہ انتخاب کنندہ کی مالی حیثیت کا کچھ لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔

امیدوار خلافت میں مندرجۂ ذیل صفات کا ہونا لازمی ہے۔

(۱) بےداغ چال چلن رکھتا ہو۔

(۲) اخلاقی اور جسمانی کمزوریوں سے پاک ہو (ترکی سلطان مراد کو اس کے اخیر زمانے میں اس کمی کی بنا پر معزول کر دیا گیا تھا)۔

(۳) دور اندیشی رکھتا ہو جو لازمۂ فرماں روائی ہے۔

(۴) بلند ہمت ہو کہ سلطنت کی حفاظت کر سکے۔

(۵) پختہ عمر ہو۔

(۶) ذکور میں سے ہو۔

خوارج کا عقیدہ ہے کہ ایک عورت بھی خلیفہ ہو سکتی ہے۔ انتخاب کرنے والے کا حق ہے کہ خلیفہ کی معزولی کا مطالبہ کرے۔ وہ اس مضمون پر بعد نماز کے مومنین کے سامنے مسجد میں تقریر کر سکتا ہے۔ یہ ذہن نشیں رہے کہ مسجد مسلمانوں کے لئے دارالندوہ ہے اور فریضۂ پنجگانہ کی عبادت کو مسلمانوں کی سیاسی زندگی سے قرابت قریبہ ہے۔ لہذا یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ کہنا کہ مسجد کا مقصد صرف اس میں نماز ادا کرنا ہے بالکل غلطی پر مبنی ہے کسی ایسے سوال پر جس کو مذہب یا مسلمانوں کی

قومیت سے تعلق ہو مسجد میں بحث ہو سکتی ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ
وسلّم و خلفائے راشدین کی تاریخیں اس طرح کے واقعات اور مثالوں سے
بھری پڑی ہیں۔ اُس زمانہ میں ساری باتیں جو خالصۃً سیاست سے تعلق
رکھتی ہیں مسجد ہی میں بحث و مباحثہ کے بعد فیصل ہوا کرتی تھیں اہل عقد
کا انتخاب کرنا لوگوں کا کام تھا اور کوئی شخص اپنے کو خلیفہ منتخب کیئے
جانے کا دعویٰ نہ کرتا تھا۔ انتخاب کے لئے کشمکش اور انتخاب کرنیوالوں کو
اپنے ہمنوا بنانے کی کوشش نہیں ہوتی تھی۔ سب سمجھتے تھے کہ انتخاب
کرنے والے خود کسی قابل اور اہل کا انتخاب کریں گے۔

قریش

اس مسئلہ کو کہ "خلیفہ اہل قریش سے ہو" لوگ صحیح طور پر نہیں سمجھتے۔
بعض احادیث میں آیا ہے کہ خلیفہ قبیلۂ قریش سے ہو گا لیکن ساتھ ہی
اس کے یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب تک کہ وہ مذہب کے قیام کی حفاظت کریں
یہ فقرہ ایک حکم شریعت ہونے کے بجائے ایک زبردست پیشین گوئی کا
پہلو رکھتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے ایسا ہی ارشاد
فرمایا ہے لیکن یہ اُس وقت آپ نے فرمایا تھا کہ جب قبیلۂ قریش کا
رعب و اقتدار تمام قبائل عرب بغیر چون و چرا مانتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے

یہ اُس وقت کہا تھا جب آں حضرت کی وفات کے بعد مدینہ والوں نے دعویٰ کیا تھا کہ خلیفہ مدینہ والوں میں سے ہونا چاہئے۔ اگر خلافت کو قبیلہ قریش میں محدود کر دینا ہوتا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کبھی فرماتے کہ قریش حامل بار خلافت رہینگے صرف اُس وقت تک جبتک کہ وہ دین کی حفاظت اور پرداخت کریں گے ورنہ بعد ازاں یہ دوسروں کے ساتھ وابستہ ہو جائے گی۔

امام احمد سے یہ بھی روایت ہے کہ حضرت فاروق اعظم نے فرمایا اگر ابو عبیدہ میری موت تک زندہ رہے تو میں اُن کو خلافت کے لئے نامزد کروں گا ورنہ معاذ ابن جبال خلافت کے لئے نامزد کئے جائیں گے اور ان دونوں میں سے ایک بھی قبیلہ قریش سے نہ تھا۔

حضرت عمرؓ کا ایک دوسرا قول ابو رافع کی روایت سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر سلیم ابو حذیفہ کا آزاد کردہ غلام زندہ ہوتا تو میں اس پر کسی دوسرے کو فوقیت نہ دیتا۔

حضرت امام رازی کا قول شرح مقاصد میں جو فقہ اسلام کی ایک مشہور کتاب ہے درج ہے۔ خلافت اسلام کی مذہبی اور دُنیوی امامت ہے اور یہ ہر مسلمان کو دی جا سکتی ہے۔

ابن خلدون مشہور مورخ لکھتا ہے کہ خلافت کسی معنی میں بھی قریش کے

لئے محدود نہیں ہے۔ یہ ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ اسامہ بن زید ایک غلام تھے ایک محارب دستۂ فوج کی افسری پر معمور کر کے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مسعود میں ایک مہم پر بھیجے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ اور اکثر دوسرے صحابۂ کرام آپ کی ماتحتی میں تھے۔ جب لوگ حرفِ شکایت زبان پر لائے تو اللہ کے رسول نے فرمایا کہ اسامہ ہی اس کا اہل ہے۔[1]

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہا کرتی تھیں کہ اگر زید زندہ ہوتے تو انکے سوا رسولؐ خدا کا خلیفہ کوئی اور نہ ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خود آنحضرت کے نزدیک بھی اہلیت اور صلاحیت ہی خلافت کے عہدہ پر سرفرازی کے لئے شرط واحد تھی اور فی الحقیقت اس کے سوا کوئی دوسری بات ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اسلام جمہوریت کی تعلیم لیکر آیا ہے آنحضرت صلعم اولادِ آدم کے مساویانہ حقوق کی منادی کرنے کو مبعوث ہوئے۔ ایسی حالت میں خلافت کو ایک خاص قبیلہ کے ساتھ محدود کر دینا تعلیم قرآنی کے کس درجہ منافی ہوگا۔ یہ گویا اسلام کے بنیادی اصول ہی کو سرنگوں کر دینا ہے۔

اہل تشیع اور اہل سنت والجماعت سنی اور شیعوں میں نفس خلافت کے مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان دونوں جماعتوں میں طریقۂ امیدواری

[1] ان اسامہ لہا اہل۔

کے بارے میں اختلاف ہے لیکن جب ایک خلیفہ مقرر ہوگیا تو سبھوں پر اُسکی اطاعت واجب ہو جاتی ہے۔ اس نقطہ پر اگر دونوں جماعتیں ہم خیال ہو جاتی ہیں۔ شیعانِ علی پہلے تین خلیفوں کے انتخاب کو جائز نہیں سمجھتے اگر مذہبی اصول کی بنا پر جب کسی اَمر کا تسلط ہو جائے اور جمہور اُسکو مان لیں تو اُس کی اطاعت واجب ہوگی۔ حضرت علی نے خود اپنے پیش رووں کی بیعت کی۔ حضرت امام حسین کے واقعہ میں بھی اکثروں کو غلط فہمی ہوئی ہے کربلا کی جنگ عظیم کے وقت تک یزید کی خلافت کلی طور پر تسلیم نہ ہوئی تھی اور مسلمانوں نے اُس کو خلیفہ تسلیم نہ کیا تھا۔ علاوہ ازیں حضرت امام کی خواہش مدینہ سے روانگی کے وقت ہرگز جنگ کرنے کی نہ تھی۔ یزیدی فوج کے سپہ سالار ابنِ سعد کی ناشائستہ حرکتوں نے آپ کو حفاظتِ خود اختیاری کے لئے تلوار اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔

منتخب شدہ خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں بہت سی مذہبی فلاح مضمر تھی اور اس سے خلیفہ کے ذاتی تقدس میں اضافہ ہوتا تھا اور اس سے "آوازۂ خلق نقارۂ خدا" کا تازہ اعلان ہو جاتا تھا۔ مذہبی تقدس جو بیعت سے منسوب تھا اُس کی بُنیاد اس عقیدہ پر تھی کہ جملہ قواعد و ضوابط جو جماعت مسلمین کی افعال و اعمال کو مقید کرتے ہیں وہ خدا کی آواز کا اظہار ہیں۔ اسی کا نام اجماع الامت ہے۔ جب سب کے سب متفق الرائے ہو کر

وقربت پیدا ہو جائے۔ اگر امام ایک خود مختار حکمراں نہیں ہے تو یہ تعلق و قربت قائم نہیں ہو سکتی۔ اور عبادت (نماز) لازمی طور پر باطل ہو جاتی ہے۔ (سید امیر علی)

مسلمانوں کی وفاداری مشروط

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا خلیفہ کے دُنیوی اقتدار کو ہندوستان نیز دیگر اسلامی سلطنتوں کے حکمرانوں و رعایا نے کبھی تسلیم بھی کیا ہے یا نہیں۔ اُن لوگوں کو جو صاحب اختیار ہیں سنجیدگی سے اس پر غور کرنا چاہیئے کیونکہ اس پیچیدہ مسئلہ کا حل کہ آیا خلافت کے لئے مذہبی وفاداری کے ساتھ دنیوی اطاعت بھی ضروری ہے یا نہیں اسی پر منحصر ہے۔ ایک مسلمان یا غیر مسلم حکمراں اپنے ماتحت مسلمان رعایا کی وفاداری حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر وہ وفاداری ان کے امام کی وفاداری میں کسی طرح کی رخنہ اندازی پیدا کرتی ہے۔ اصول محض صاف اور سادہ ہیں۔ خدا اور مذہب کی وفاداری کو کسی خالص دُنیاوی حکمراں کی وفاداری پر ہمیشہ ترجیح دینی چاہیئے۔ جیسا کہ ظاہر کیا جا چکا ہے۔ مسلمانوں کے یہاں خلیفہ کی اطاعت و وفاداری کے معنی خدا کی اطاعت و وفاداری ہے۔ شریعت اسلامیہ کے بموجب مسلمانوں کا کوئی حکمراں خلیفہ اسلام کے اقتدار کی مخالفت میں مسلمانوں سے قانوناً اور جائز طور پر اطاعت کی امید نہیں رکھ سکتا۔ اگر کوئی مسلم یا

غیر مسلم حکمران اپنی مسلم رعایا سے اطاعت و وفاداری کا خواہشمند ہے
تو اسے چاہیئے کہ خلیفۂ اسلام و امیر المؤمنین سے دوستانہ مراسم
رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں حقوق خلافت کے متعلق
سیاسی و مذہبی مباحث بہت اہم ہیں۔

خلافت کی سیاسی اہمیت اس قدر زبردست تھی کہ اس وقت بھی
جبکہ خلیفہ اپنی تمام دنیوی اور سیاسی طاقتیں کھو چکا تھا۔ بڑے بڑے
فاتح اور سردار اپنی حکومت و طاقت کی منظوری کے لئے اس سے استدعا
کرتے تھے۔ خلیفہ کا فرمانِ منظوری ان کے اقتدار کو جائز بنا دیتا تھا۔ ان
کے مفتوحات و ممالک کی جائز حکومت ان کے سپرد کر دیتا تھا اور ان کے
خلاف ہر قسم کی بغاوت عامہ کو ناجائز اور خلاف مذہب قرار دیتا تھا۔ یہ
فرمان ایک سند کی صورت میں خلعت کے ساتھ عطا ہوتا تھا۔ دوسرے
ممالک کے مسلمان حکمران خلیفہ کو اپنا شہنشاہ تسلیم کرتے تھے۔ اس کا نام
اپنے سکوں پر کندہ کراتے تھے اور جمعہ اور عید کی نمازوں کے خطبہ میں اس کا
نام لیتے تھے۔ نظری طور پر اسلام کی غیر منقسمہ حکومت کا یہ فسانہ تاریخ
اسلام کے مختلف دور میں قائم رہا۔ اسے اتنی اہمیت دی جاتی تھی کہ
پیغمبر صلعم کے انتقال کے وقت مدینہ کے مسلمان آپ کی تجہیز و تکفین کے
پیشتر ہی خلیفہ کے انتخاب میں مصروف ہو گئے تھے خلیفہ اور امیر المؤمنین کا نام

اہتمام سے استقبال کیا۔ مصنف تاریخ فیروز شاہی لکھتا ہے کہ
اس تاریخ سے عام حکم دیدیا گیا کہ خطبہ میں جب بادشاہوں کا نام لیا
جائے تو ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کردیا جائے کہ انہیں اقتدار اور فرمان
حکومت خلفائے عباسیہ سے ملا ہے۔ جن بادشاہوں کو اس قسم کا فرمان
حکومت نہیں ملا ان کا نام خطبہ سے خارج کردیا جائے اور یہ اعلان کردیا
جائے کہ تمام بادشاہ خلیفہ کے ماتحت ہیں۔ سلطان محمد تغلق نے
نائب خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ ہندوستان کے نیک دل حکمراں فیروز شاہ
کو بھی مصری خلیفہ کی طرف سے خلعت اور سند عطا ہوئی تھی۔ وہ خلیفہ
کے سفیر کے استقبال کے لئے اپنے ارکین سلطنت کے ساتھ ننگے پاؤں
گیا۔ ہندوستان کے بادشاہ خلیفہ کی طرف سے عطا کئے ہوئے خلعت
اور سندِ حکومت کو سب سے بڑی عزت تصوّر کرتے تھے جیسا کہ نادر شاہ
نے خود لکھا ہے "من چہ ایں مرتبہ دارم کہ جامہ از حضرت خلیفہ التماس
کنم" دوسری جگہ کہا ہے حضرت اللہ تبارک و تعالیٰ و قدرت اعلیٰ در دل
خلیفہ الہام کرد تا بعیر واسطہ التماس فیروز شاہ از درگاہِ حضرت خلافت
جامہ رسید"[۵۳] تک تمام مسلمان بادشاہوں کے سکّوں پر خلیفہ کا نام کندہ
ہوتا تھا۔ اس طرح ظاہر ہوگیا کہ خلیفہ کے اقتدار کو صرف عام مسلمان ہی تسلیم

---

[۵۳] تاریخ فیروز شاہی جلد ۳ صفحہ ۲۴۹ و ۲۵۰۔

نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کسی مسلمان بادشاہ نے بھی کبھی اس سے بڑا کوئی دعویٰ پیش نہیں کیا کہ وہ خلیفہ کے نائب کی حیثیت سے حکمرانی کرتا ہے اگر اس رواج اور قاعدہ میں اکبر کے دور حکومت ہند میں کوئی عارضی نقصان واقع ہوا تو اس کی وجہ ظاہر ہے۔ وجہ یہ تھی کہ اکبر خود ایک طرح کی طاقت الٰہیہ کا دعویدار تھا اسی باعث سے مسلمانان ہند اکبر کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

اب بحث یہ ہے کہ سلطان ٹرکی کو دیگر ممالک اسلامیہ خصوصاً ہندوستان میں کس وقت سے خلیفہ تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں فتح مصر کے بعد سلیم صرف اس حکومت اسلامیہ کا جس کو اس نے بزور شمشیر قائم کیا تھا حکمران ہی نہیں بلکہ تمام دُنیائے اسلام کا مذہبی مقتدا مانا گیا۔ لین پول نے لکھا ہے کہ ایران کے شیعہ خواہ اس کے دعوے کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُس وقت سے ہندوستان ایشیا کے تمام دیگر علاقے اور افریقہ جہاں خلافت تسلیم کی جاتی تھی سلاطین عثمانیہ کو اسلام کا مذہبی مقتدا اور خلافت کے روحانی اقتدار کا باعث قرار دینے لگے تھے۔ آگے چل کر مذکورۂ بالا فاضل مورخ کہتا ہے کہ یہ جانشینی خلافت سلاطین عثمانیہ کے احکام و فرامین میں ہمیشہ اُس وقت تک ایک قسم کا حقیقی اور اہم اقتدار پیدا کرتی چلی آئی ہے۔ یہ ہے شہادت اُس

انگریزی کی جو ایک مشہور مورّخ مانا جاتا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں بھی سلاطین عثمانیہ کے دعوئ خلافت کو گجرات کے حکمراں اور چین۔ کولمبو۔ جزائر سماترا۔ جاوا اور جزیرہ نمائے ملایا کے تمام مسلمان تسلیم کرتے تھے۔ مسلمانان ہند نے بھی سلطان ٹرکی کو برابر خلیفہ تسلیم کیا ہے ہندوستان میں بارہویں صدی ہجری کے مشہور مجتہد حضرت شاہ ولی اللہ نے اس کا تذکرہ اپنی کتاب تفہیمۃ الاحیا میں بھی کیا ہے۔ یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ سلیم اوّل نے متوکل سے منصب خلافت ۱۵۱۷ء میں حاصل کیا۔ اس کے چند ہی سال بعد ۱۵۳۳ء میں جب ہمایوں نے گجرات کے حکمراں بہادر شاہ پر حملہ کیا تو اُس نے فوراً ایک سفیر سلطان سلیم اعظم کی خدمت میں روانہ کیا اور خلیفہ سے مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ ۸۰ جہازوں کا ایک جنگی بیڑا ۱۵۳۸ء میں بھیجا گیا جس نے ایک کامیاب جنگ کے بعد پرتگالیوں سے دو قلعے کوکل اور کٹ چھین لئے۔ اس کے بعد یہ بندر ڈٹو کی طرف روانہ ہوا لیکن بہادر شاہ کے بیٹے ملک محمود نے جو اس زمانہ میں گجرات کا حاکم تھا سامانِ خوراک اور نیز دیگر امداد کی ارسال سے انکار کیا اور عثمانی کمانڈر کو مجبور ہو کر واپس ہونا پڑا۔ اس کے بعد سے برابر سلطان سلیم اعظم ہندوستان کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ درحقیقت وہ اس زمانہ کے تمام مشرقی اسلامی حکومتوں کو خلافت کے زیرِ اقتدار لانا چاہتا تھا اور بحیرِ عرب اور خلیج فارس

میں اسکے تگ وتاز کی یہی وجہ تھی۔ وہ مسلمانوں کا روحانی مقتدا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ تمام اسلامی دنیا اسے اپنا مذہبی پیشوا تسلیم کرے چنانچہ مکہ کے تقدس مآب فقہا اور علماء کے فتوے اور سفراء چین۔ ہندوستان اور افغانستان کی طرف بھیجے گئے۔ چونکہ سلطان ٹرکی کا نام اور اُس کی قوت عام طور پر ہر جگہ مشہور تھی اور اُس کی حکومت کی روز افزوں ترقی کا قصہ ہر شخص کی زبان پر تھا، اس لئے لوگ اسکے حقوق خلافت کے بہت جلد قائل ہو گئے عثمانی بیڑے کے کمانڈر سیدی علی رئیس نے (جو ہرمز کو پرتگالیوں سے چھیننے کے لئے بھیجا گیا تھا) اپنی سیاحت ہند، افغانستان، و فارس کے دلچسپ حالات و واقعات بیان کئے ہیں یہ بیڑا ساحل گجرات پر لنگر انداز ہوا اور جب مسلمانانِ سورت نے انہیں (ترکوں کو) آتے ہوئے دیکھا تو بڑی خوشی منائی۔ اس کتاب کا نام مرآۃ الممالک ہے۔ اس کا ترجمہ جو ہنری فریڈرک فان ڈیز نے جرمنی زبان میں کیا ہے اور جو ابتدا میں اس کی کتاب ڈن ورڈ نگ کیٹن فان اسین میں شائع ہوا تھا ہمارے پیش نظر ہے۔ سیدی علی رئیس کے بیان کردہ حالات سے ہمارے موجودہ مبحث پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔

ہندوستان میں وہ جہاں گیا وہاں کے مسلمانوں نے بادشاہ اسلام (سلطان ٹرکی) کے سفیر کی حیثیت سے اس کی بڑی خاطر و مدارات کی ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے اس جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا کہ وہ

خود اس پر اظہار تعجب کرتا ہے انھوں نے اس کے سامنے ایڈریس پیش کئے
جس میں بادشاہِ اسلام کے ساتھ وفاداری و اطاعت کا اظہار کیا۔ سیدی علی
رئیس کہتا ہے "جب میں گجرات میں تھا تو وہاں سلطان اس کے وزیر اعظم عماد الملک
اور دیگر اراکین سلطنت سے میری ملاقات ہوئی۔ سلطان نے سب کے سامنے میں نے
اپنی سند پیش کی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ہمارے بادشاہ کے ساتھ
اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔" ایک دوسرے ہندوستانی رکن سلطنت نے ایک مرتبہ
کہا "ہم لوگ سلطان ترکی سے کسی طرح جنگ نہیں کر سکتے ہم کو اس (سلطان
ترکی) کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی دنیا کا بادشاہ ہے۔

اسی کتاب میں خطبہ اور خلافت کے متعلق شہنشاہ ہمایوں اور ترکی
امیر البحر کا ایک دلچسپ مکالمہ درج ہے جو بہت طویل ہے ہم مختصراً اس موقعہ
پر صرف ایک دو واقعات لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

دورانِ مکالمہ میں امیر البحر نے شہنشاہ ہند کو مطلع کیا کہ چین کے بعید
علاقوں میں بھی اس کے بادشاہ کا نام خطبہ میں شامل کرنے کی اجازت دے
کیونکہ وہ مکہ مدینہ اور قبلہ کا بادشاہ ہے۔ خاقان اگرچہ غیر مسلم تھا لیکن
اس نے درخواست کو انصاف پر مبنی سمجھ کر منظور کر لیا۔ بلکہ اس نے
یہاں تک مہربانی کی کہ خطیب کو خلعت عطا کی اور ہاتھی پر سوار کر کے تمام
شہر میں اس کا جلوس نکالا۔" کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ کی خبر گجرات کے تاجر

چین سے لائے اور سیدی علی رئیس سے اس کا انہوں نے ذکر کیا
چنانچہ سیدی علی رئیس لکھتا ہے کہ اُس وقت سے بادشاہِ ٹرکی کا نام برابر
خطبہ میں داخل چلا آتا ہے۔ ایک دوسرے موقعہ پر شہنشاہ ہمایوں نے
امیر البحر سے پوچھا کہ کیا خان کریمیا بھی سلطان ٹرکی کا ماتحت ہے؟ جب
اس کا جواب اثبات میں دیا گیا تو اس نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو اسے خطبہ کا
حق کیونکر حاصل ہے؟ امیر البحر نے جواب دیا کہ یہ ایک واضح حقیقت ہے
کہ صرف میرے بادشاہ کو یہ حق حاصل ہے کہ جس کو چاہے خطبہ کا حق عطا
کرے۔ سیدی موصوف کہتا ہے کہ اُس کے اس جواب سے لوگوں کو اطمینان
ہوگیا اور ہمایوں نے اپنے امرا کو مخاطب کرکے کہا "یقیناً اگر بادشاہ (خلیفہ)
کے خطاب کا کوئی شخص جائز حقدار ہوسکتا ہے تو وہ سلطان ٹرکی ہے
دنیا میں صرف وہی اُس کے قابل ہے اور کوئی دوسرا نہیں" اس کے بعد
بادشاہ اور اُسکے ارکین دولت نے خلیفۂ اسلام ترکی کے لئے دعا مانگی۔
اسکے بعد سیدی علی رئیس بلوچستان کے مغربی ساحل پر گادور کے بندرگاہ
میں لنگر انداز ہوا۔ وہاں کا حکمراں جلال الدین بن ملک دینار تھا۔ گادور
کا حاکم جہاز پر آیا اور خلیفۂ اسلام (سلطان ٹرکی) کے ساتھ وفاداری کا
یقین دلایا۔ اکبر نے دنیائے اسلام کے مذہبی اقتدار پر قبضہ کرنا
چاہا اور اپنی رعایا سے یہ خواہش کی کہ وہ اسے خلیفہ سمجھیں اس نے

حضرت سلطان الاسلام خلیفۃ الانام اور امیر المومنین کا لقب اختیار کیا اکبر کی روحانی نیز دینی پیشوا ہونے کی خواہش کا اظہار ابوالفضل کے باپ شیخ مبارک کی اس تحریر سے ہوتا ہے جس کے چند جملے یہ ہیں: "اس لئے اگر آئندہ کبھی کوئی مسئلہ درپیش ہو جس کے متعلق علماء اور مجتہدین کی رایوں میں اختلاف ہو اور حضرت اعلیٰ (اکبر) قوم کے فوائد اور سیاسی ضروریات کے لحاظ سے ان میں سے کسی رائے کو قبول کرنا چاہیں تو انہیں کامل آزادی حاصل ہے" لیکن اس کے ان فرضی دعاوی کا مسلمانوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور اسے اپنے ارادہ باطل میں محض ناکامیابی نصیب ہوئی۔ اکبر کے زمانہ کے بعد سے مغلیہ بادشاہوں کا خلافت عثمانیہ کو تسلیم کرتا نہیں پایا جاتا۔ شاید اس کا یہ سبب ہو کہ وہ ترکی بادشاہوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے کیونکہ ۱۴۰۲ء میں تیمور نے عثمانیہ سلطنت کو شکست دی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سلاطین عثمانیہ کے ساتھ مغل بادشاہوں کا برتاؤ غرور آمیز تھا لیکن سوا اکبر کے کسی دوسرے بادشاہ نے کبھی دعویٰ خلافت نہیں کیا۔ ان کی مسلمان رعایا ہمیشہ ترکی بادشاہوں کو خلیفہ جائز سمجھتی رہی۔ ہند کے جو مسلمان مکہ معظمہ کو جاتے وہ خطبہ میں سلطان ترکی کا نام سنتے اور اسی کی سیادت و امامت کے تحت میں فریضہ حج ادا کرتے۔ بارہویں صدی ہجری میں تحفۃ العالم کا مصنف جزائر جاوا سماترا وغیرہ کے ایک سیاح کے حالات بیان کرتا ہے

اس میں وہ ظاہر کرتا ہے کہ مساجد میں سلطان روم کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور ان جزائر کے مسلمان ہر جمعہ کو سلطان کی سلامتی و فلاح کی دعائیں مانگتے تھے سنہ ۱۷۶۱ء (۱۱۷۵ھ) میں اورنگ آباد کا باشندہ سید قمر الدین حج سے واپسی میں کلمبو میں ٹھہرا اور وہاں اس نے مسلمانوں کو جمعہ کی نماز میں سلطان روم کے لئے دعائیں مانگتے ہوئے دیکھا۔ کیونکہ وہ مقامات مقدسہ کا محافظ تھا۔ موجودہ زمانہ میں بھی ملک افغانستان کے آزاد اور خود مختار حکمراں امیر عبد الرحمن خاں نے سلطان عبد المجید خاں کو خلیفہ تسلیم کیا اور ان کے ہاتھوں سے فرمانِ حکومت اور سراج الملۃ والدین کا خطاب پایا اس لئے تاریخی نقطۂ نگاہ سے اس قسم کے واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ہرگز بیجا نہ ہوگا کہ حکومت مغلیہ کے ابتدائی ایام میں بھی جبکہ خلافت کو خاندان عثمانیہ میں منتقل ہوئے تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا سلطان ٹرکی کو ہندوستان میں خلیفہ تسلیم کیا جاتا تھا جس وقت سیدی علی رئیس اس ملک میں آیا ہے اس وقت خلافت کو قسطنطنیہ میں منتقل ہوئے کل ۳۶ سال ہوئے تھے اور جیسا کہ ظاہر کیا جا چکا ہے اس قلیل مدت میں بھی بادشاہ اسلام کا اقتدار مسلمانانِ ہند میں ہر جگہ قائم ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانانِ ہندوستان ہر سال ایک کثیر تعداد میں فریضۂ حج کی ادائگی کے لئے مکہ معظمہ جایا کرتے تھے۔ اس لئے یہ اغلب کہ وہ وہاں سے

محافظ حرمین شریفین کی عزت اور محبت اپنے دل میں لیکر واپس نہ آتے ہوں اور اُن احساسات کو ملک میں پھیلاتے ہوں۔ اس لئے یہ فرض کرنا تاریخ کے غلط معنی پہنانا ہیں کہ سلطان ٹرکی کی خلافت کا خیال اس ملک میں بالکل نئی چیز ہے جو گزشتہ پچاس سال کے اندر پیدا ہوئی ہے اور وہ سیاسی "پین اسلامک" تحریک کا نتیجہ ہو۔ نیز یہ کہ اس دعویٰ کی خلافت میں مسلمانان ہندوستان کی طرف سے سلطان ٹرکی کے ساتھ دُنیوی اطاعت کے اظہار کا مفہوم شامل ہو کوئی تاریخی بنیاد نہیں ہے"

انگلستان اور خلافت

سر ویلنٹائن چیرول مشہور اہل قلم و ماہر سیاست نے حال ہی میں مدراس کے "ہسٹری یونین" (انجمن تاریخ) کے جلسہ میں یہ کہہ کر کہ سلاطین[1] عثمانیہ کی خلافت کو اسلامی دُنیا نے کبھی تسلیم نہیں کیا

[1] ottomam Sul tans

اسلامی تاریخ سے اپنی عدم واقفیت کا قابل افسوس ثبوت دیا ہے ہم
اس کی تشریح کرنے سے مجبور ہیں کہ سر ولیم میور اس غلطی میں کیوں اور کس
طرح پڑے؟ اب ہم اپنے اصل مطلب پر آتے ہیں مسئلہ خلافت کی اہمیت
اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ غیر مسلم بادشاہوں نے بھی مختلف اوقات
میں خلیفہ کے اقتدار کو اپنی اغراض کے حصول کے لئے استعمال کرنے کی
کوششیں کی ہیں۔ نپولین تو ایک قدم اور آگے بڑھ گیا تھا۔ اس نے خلافت
کی اہمیت اور مفید ہونے کا پورا پورا اندازہ کیا اور یہ چاہا کہ خود ہی خلیفہ
بن جائے۔ یہ اس کی دلی خواہش تھی کہ مشرق میں ایک عظیم الشان سلطنت
قائم کرے اور جیسا کہ ظاہر ہے اس نے علانیہ کلمہ پڑھا اور دینِ اسلام قبول
کیا۔ اس کی یہی خواہش تھی کہ وہ اسلام کا مقتدا بن جائے شاید وہ یہ سمجھتا
تھا کہ جو بات تین سو برس قبل سلطان سلیم کے لئے ممکن تھی آج اس کے
لئے بھی ممکن ہو سکتی ہے مسٹر بلنٹ کے الفاظ ہیں "دریائے نیل کی جنگ نے
کتنی بڑی عظیم الشان تجویز ملیامیٹ کر دی" برطانوی حکومت نے بھی ایک
سے زائد مرتبہ خلیفہ کے اقتدار اور سطوت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ موجودہ زمانہ
میں غیر مسلم سلطنتوں میں سے انگریزی حکومت ہی ایک ایسی سلطنت ہے
جو مسلمانانِ ہند پر خلیفہ کے اختیار و اقتدار کو تسلیم کرنے میں سب سے زیادہ پیش
پیش رہی ہے ٹیپو سلطان اور گورنر جنرل لارڈ مارننگٹن کے مابین مراسلت

ہوئی ہے۔ یہ مراسلت ضمیمہ ج کے نام سے کتاب "ٹیپو سلطان سے جنگوں کی ابتدا" ترقی اور فیصلہ کن جنگوں کے نتائج پر ایک تنقید [1] کے آخر میں دی ہے جس کو بیوہنسار [2] لنکنس ان فیلڈس نے ٹی کیڈل اور ڈبلو ڈیوس سٹرانڈ کے لئے سنہ ۱۸۰۰ء میں طبع کی ہے۔ اس نہایت دلچسپ مراسلت کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ برطانوی گورنمنٹ نے مشرق میں اپنی حکومت کی توسیع کے نازک زمانہ میں سلطان روم سے امداد کی خواہش کرنے میں تامل نہیں کیا۔ اُس نے سلطان روم کو مسلم شریعت اسلامیہ اور حکومت کا پیشوا اور دین اسلام کی مقدس یادگار ہونا تسلیم کیا۔ گورنر جنرل لارڈ مارننگٹن نے ٹیپو سلطان کی خدمت میں خلیفہ کا خط ان الفاظ کے ساتھ بھیجا "میں اعلیٰ حضرت کی خدمت میں اس کو پیش کرتا ہوں۔ اعلیٰ حضرت اس کو پڑھینگے اور اس کا اُس عزت کے ساتھ جس کا یہ مستحق ہے لحاظ فرمادیں گے" برطانوی حکومت کی یہ خواہش تھی کہ ٹیپو سلطان فرانسیسیوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے انگریزوں نے سلطان روم سے ایک خط حاصل کیا۔ اس دوستانہ تنبیہ کا ٹیپو سلطان پر کافی اثر پڑا۔ اور اُس نے خلیفہ کو ان الفاظ میں جواب دیا "چونکہ فرانسیسی قوم کے

---

[1] A Review of the origin Progress and result of the decisive war with the late Tipu Sultan.

تعلقات باب عالی سے کشیدہ ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنے کو باب عالی کا مخالف بنالیا ہے۔ اس لئے وہ پیروان دین اسلام کے دشمن ہیں اور تمام مسلمانوں کو ان کی دوستی سے انکار کر دینا چاہیئے"۔ انگریزی حکومت کس منہ سے خلافت عثمانیہ کے اقتدار سے منکر ہو سکتی ہے جبکہ اس نے خلیفہ کے اقتدار کو نہ صرف تسلیم کیا اور اس کا اقرار کیا ہے بلکہ اس سے فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ انگریزی حکومت خودداری کو ملحوظ رکھ کر یہ کس طرح کہہ سکتی ہے کہ "ہم اس کو نہیں تسلیم کر سکتے کہ خلیفہ کو ہندوستانی مسلمانوں پر کسی قسم کا بھی دنیاوی اقتدار حاصل ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن سے تاریخ سے کوئی لگاؤ نہیں" یا یہ کہنا کہ "سلطان روم مسلمانوں کے جہاں کہیں بھی وہ ہوں روحانی پیشوا ہیں"، گزشتہ انیسویں صدی کی اختراع ہے۔ اگر گورنر جنرل کی درخواست سلطان روم کا جواب اور ٹیپو سلطان کی اطاعت محض کاغذ کے پرزے (دفتر بے معنی) سمجھے جائیں تو ایسا سمجھنا کچھ حرج نہیں ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر سلطان روم کی مسلمانوں پر اقتدار کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مستند کاغذات کے مقابلے میں تاریخ کی روایتوں کا پیش کرنا زیادہ قابل وثوق نہیں ہے۔ ہم بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس مسئلہ کا جہاں تک انگریزی حکومت سے تعلق تھا اس کو گورنر جنرل لارڈ مارننگٹن نے ۱۶ر جنوری ۱۷۹۹ء میں ہمیشہ کے لئے طے کر دیا ہے

لیکن یہی ایک مثال نہیں ہے بلکہ سنہ ۱۸۵۸ء میں بھی برطانوی حکومت نے
سلطان عبد المجید مرحوم سے مسلمانانِ ہندوستان کے نام ایک فرمان اس
مضمون کا حاصل کیا کہ مسلمانوں کو انگریزوں سے صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہیے
کیونکہ انگریز ان کے خلیفہ کے دوست ہیں جس کا مسلم آبادی پر نہایت ہی اچھا اثر پڑا
اُس وقت سے برابر ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کو اپنے دوست اور
محافظ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ان کو انگریزوں کی راستبازی اور ایمانداری
پر ایسا اعتقاد ہو گیا تھا کہ اُنہوں نے اپنی ملکی تحریکوں سے پہلو تہی اختیار کی
بلکہ بعض مواقع پر بڑی مخالفت کی۔ اگر ہم مسلمانوں کے اس طرزِ عمل اور انکی
سنہ ۱۹۱۱ء تک کی سیاست کے اسباب کا ذرا غور سے مطالعہ کریں تو ہم کو یہ بات معلوم
ہو جائے گی کہ اس مسلمہ نتیجہ کے پیدا کرنے میں اس گہری دوستی نے جو برطانوی
اور ترکی حکومت کے مابین تھی کچھ کم اثر نہیں کیا۔ کریمیا اور دیگر روسی و ترکی جنگوں
کے واقعات نے مسلمانوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ انگریز ان کے خلیفہ کے سچے
دوست ہیں اور جب کبھی اُنہوں نے انگریزوں کی اس سیاست میں کوئی تغیر
دیکھا تو اُن کو صدمہ ہوا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۹۷ء میں جب روم و یونان کی جنگ میں
برطانوی حکومت نے یونانیوں پر مہربانی کرتے ہوئے ترکوں کے ساتھ جو غیر منصفانہ
طرزِ عمل اختیار کیا تھا اس کی اُنہوں نے سخت نکتہ چینی کی نیز سنہ ۱۹۰۶ء میں
عقبہ کے جھگڑے کے وقت بھی ہندوستان کے مسلمانوں نے بالاتفاق لارڈ

لیبنسڈاون کے اس غیر منصفانہ حملہ کے خلاف جو اُنہوں نے کیا تھا صدائے احتجاج بلند کی اور یہ واقعہ اُس زمانے کا ہے جبکہ گورنمنٹ کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری اپنے شباب پر تھی۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس وقت اُن کی آواز اس قدر پُرزور اور بلند نہ تھی جس کی وجہ یہ ہو گی کہ ان کو اس وقت بھی انگلستان کی راستبازی اور ایمانداری پر اعتقاد تھا لیکن افسوس کہ انگلستان اپنے ہر فعل سے یہ ثابت کر رہا ہے کہ مسلمانوں کو اب انگلستان کے ضمیر اور نیک نیتی پر بھروسہ نکرنا چاہیئے۔ مسلمان اُس وقت تک قانع رہے جب تک کہ برطانوی حکومت نے خلیفۃ المسلمین سے ظاہری دوستی کا ڈھانچہ بھی قائم رکھا لیکن جونہی کہ برطانوی محکمۂ خارجہ نے اس دوستی سے قطع تعلق کیا مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہو گئی اور اس کے بعد ہی علانیہ مخالفت شروع ہو گئی۔ اس حالت کے پیدا ہونیکے اسباب کیا تھے؟ اس بارہ میں یا تو ہم کو نوجوان ترکوں کی ناتجربہ کاری کا شکریہ ادا کرنا پڑے گا۔ یا اسے سر ایڈورڈ گرے کی مشرقی پالیسی کا نتیجہ سمجھنا پڑیگا۔ ان باتوں پر ہم آگے چلکر مختصر بحث کرینگے یہی سے حسد اور بغض کہ کتنا سر ایڈورڈ گرے کی خارجی پالیسی کا بنیادی اصول تھا اس لئے اس کی رضامندی حاصل کرنے کی غرض سے اُنہوں نے دوستانہ تعلقات رکھنے والی اسلامی ریاستوں کی یکے بعد دیگرے قربانی کر ڈالی۔ ایران کی داستان اس قدر دردناک اور طویل ہے کہ یہاں اس کو مختصراً بیان کرنا بھی مشکل ہے

اگر ہم سے اس گزشتہ عظیم الشان جنگ کا سبب دریافت کیا جائے تو ہم کو اس بات کے کہنے میں کچھ بھی پس وپیش نہ ہوگا کہ اس جنگ کا بنیادی سبب ہمارے سابق بادشاہ ایڈورڈ ہفتم اور سر ایڈورڈ گرے کی خارجیہ پالیسی ہے۔ اتحاد ثلاثہ جس کی تکمیل ۱۹۰۷ء میں ہوئی اس کا منشا سوا جرمنی کی مخالفت کے اور کچھ نہ تھا اور ۱۹۰۷ء کا روسی انگریزی معاہدہ ایک طرح سے جرمن سے اعلان جنگ تھا مگر یہ تمام بحثیں اس مختصر رسالے کی حدود سے باہر ہیں۔ ہم اب یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ انیسویں صدی کے پچھلے حصہ میں انگلستان نے ترکوں کے متعلق کیا طرز عمل اختیار کیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو آج کل یہ بات بار بار یاد دلائی جاتی ہے کہ انگلستان نے کریمیا کی جنگ میں اور دوسرے وقتوں میں ان کے خلیفہ کی مدد کی تھی ان قیمتی امدادوں سے جو برطانیہ نے وقتاً فوقتاً ترکی سلطنت کو دیں ہرگز انکار نہیں ہوسکتا لیکن چونکہ ان کا بار بار اعادہ کیا جاتا ہے اس لئے ان کی حقیقت کا ظاہر کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں پہلی بات جس کا واضح کردینا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ مسئلہ شرقیہ کیا چیز ہے؟

مسئلہ شرقیہ کا اگر وسیع مفہوم لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ اس ملک پر جو اُس وقت سلطان کے قبضہ میں تھا کون حکومت کرے۔ دوسرے مختصر لفظوں میں اس کو یوں سمجھنا چاہیے "فلاں فلاں ملک میں فلاں فلاں خیز بیاں ہیں جن کی مجھے

ضرورت ہے اُس کو کیونکر لے سکتا ہوں اور دوسرے لوگوں کو اپنے سے زیادہ لینے سے کیونکر روک سکتا ہوں "

انگلستان نے کیوں ترکوں کی تائید کی؟

انیسویں صدی کے آخری نصف میں انگلستان کی پالیسی کی بنیاد روس کا خوف تھا۔ ہندوستان کے آمد و رفت کے راستوں کا محفوظ رکھنا انگلستان کے لئے ایک اہم [illegible] سمجھا جاتا تھا اور جبتک کہ روس [illegible] کے شمال میں رہا انگلستان کے آمد [illegible] کے وسائل محفوظ رہے۔ کیونکہ روس اور ہندوستان کے مابین تمام یورپین ترکی اور ایشیائے کوچک پڑتا تھا اور اس حصہ میں اس کے پاس کوئی ایسا مقام نہ تھا جس کو وہ اپنے بیڑہ کے لئے جارحانہ پیشقدمی کا مرکز بنا سکے۔

یہی وہ راز ہے جو اُنیسویں صدی کے آخری نصف حصہ میں انگریزوں کو ترکوں کی تائید کراتا رہا۔ انگلستان کوئی بے غرض دوست نہ تھا اور اس لئے اُس کو ترکوں سے اس قدر احسانمندی کی توقع نہیں رکھنا چاہیے جس کا کہ وہ دعویدار ہے اگر اُس کی نیت صاف اور بے مطلب ہی ہوتی تو وہ ایسی توقع کر سکتا تھا۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوران جنگ کریمیا میں انگلستان کے لوگوں کو ترکوں سے ایک حد تک ہمدردی تھی۔ لیکن دیکھنا چاہیے کہ لارڈ پالمرسٹن کریمیا کی جنگ میں انگریزوں کے شرکت کی کیا وجہ بتاتے ہیں۔

لے مشرق میں انگریزوں کی سیاسی پالیسی مصنفہ بیرن۔ اے دی ورس

دول عظام خمسہ نے ایک باضابطہ دستاویز میں بھی اس رائے کا اندراج کیا ہے کہ یورپ کا عام فائدہ اس میں ہے کہ عثمانیہ سلطنت کی پیوستگی اور آزادی کو قائم رکھا جائے اور یہ دکھانا آسان ہے کہ مضبوط سیاسی اور تجارتی وجوہات کے بنا پر انگریزوں کا بالخصوص فائدہ اس میں ہے کہ یہ پیوستگی اور آزادی قائم رکھی جائے۔ ہم اپنی غرض اور اپنے فائدے کے لئے ترکوں کی امداد کرتے ہیں۔ اگر ہم محض اس وجہ سے کہ ترک ہمارے دشمنوں کا اتنا لحاظ نہیں کرتے جتنا کہ ہونا چاہئے اُن کی مدد کرنا چھوڑ دیں یا اس میں کچھ کمی کر دیں تو اس کا[1] یہ نتیجہ ہو گا کہ ہمارا قومی مفاد دوسروں کے نظر رحم کا محتاج ہو جائے گا۔"

جبکہ وہ مضبوط سیاسی اور تجارتی وجوہات جاتے رہے۔ انگریزوں نے ترکوں کی تائید سے ہاتھ روک لیا۔ کریمیا کی جنگ کچھ سلطان کی خواہش سے نہیں ہوئی تھی بلکہ لارڈ سٹرٹیفرڈ ری ڈکلف نے بابِ عالی کو جنگ پر مجبور کیا تھا۔ سلطان کی گورنمنٹ کو ترغیب دی گئی تھی کہ وہ وائنا کی یادداشت کو نامنظور کر دے اور کہا گیا تھا کہ اگر لڑائی تک نوبت پہنچی تو انگریز امداد دیں گے۔ یہ یونانی کلیسا اور لاطینی کلیسا کا جھگڑا تھا جس نے جنگ کرائی۔ ترکوں کو تو اس سے کچھ تعلق نہ تھا۔ روس اور انگلستان

[1] حیات لارڈ پالمرسٹن مصنفہ آنریبل ایولین ایشلی

دونوں لڑنا چاہتے تھے اور وہ لڑے۔ درحقیقت یہ روس اور انگلستان کی جنگ تھی۔ قبل اس کے کہ اتحادی مدد کے لئے آئیں۔ ترکوں نے روسیوں کو سلسٹریا کے سامنے سے بھگا کر دینوب کے پار کر دیا تھا۔ اور جنگ کا مقصد جہاں تک کہ اس کا ترکوں سے تعلق تھا عملی طور پر حاصل ہو گیا تھا۔

۱۸۷۷ء کی جنگ میں بھی انگریزوں نے ابتدا میں لاپرواہی دکھائی لیکن جب ترکی سلطنت کو شکست ہوئی اور اس کے دشمن روس کی طاقت بڑھ گئی۔ تب انگریزی سلطنت نے ہاتھ پاؤں ہلائے اور اس کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے۔ عہد نامہ سین سٹیفانو کی شرائط صلح نے تمام یورپ میں اس سرے سے اس سرے تک لرزہ ڈال دیا اور اخبارات نے حرارت آمیز بحثوں کا ایسا طوفان برپا کیا کہ کوئی وزارت ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ مسئلہ شرقیہ کا مناسب حل نہیں تھا۔ چنانچہ برلن کی مشہور مجلس مشاورت جمع ہوئی۔

اس مجلس مشاورت کے جمع ہونے کے ٹھیک ایک ماہ پہلے برطانوی وزیر اعظم نے سلطان سے بذریعہ ایک خفیہ عہد نامہ کے جزیرہ قبرص اس صلہ میں لے لیا کہ وہ ہمیشہ عثمانی سلطنت کے اقتدار کی عزت کریں گے اور اس آنیوالی مجلس مشاورت میں ترکی حکومت کی تائید کرینگے۔ معاہدۂ قبرص کا مطلب "ڈسریلی"، "سالسبری" اور "لیارڈ" کے ذہنوں میں یقیناً یہی تھا کہ

بضابطہ طور پر انگریزی حکومت کا زبردست اثر ایشیائی ترکی پر قائم کر دیں۔
ڈسریلی نے اپنے زمانہ شباب میں ایک ناول ٹنکریڈ
لکھا تھا اس میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ بادشاہِ انگلستان کے زیر حکومت
ایک عظیم الشان ایشیائی سلطنت قائم کی جائے جس میں جزیرہ قبرص خاص
طور پر شامل ہو جس سے انگریزوں کے بادشاہ رچرڈ کی حکومت کی یاد تازہ
ہو جائے۔

مجلس مشاورت برلن میں بیٹھی اور شروع میں یہ تجویز ہوئی کہ ہر سفیر کو
ایک ابتدائی اقرار نامہ اس بات کا کرنا چاہیے کہ اس کی حکومت متنازعہ فیہ
مسئلہ کے متعلق ہر قسم کے پوشیدہ معاہدہ سے آزاد ہے۔ ڈسریلی اور سالسبری
کی سٹی گم ہو گئی اور وہ اس سے انکار نہ کر سکے اور دوسرے سفراء کی طرح ان
کو بھی اس سے اتفاق کرنا پڑا انھوں نے اس پر اپنی مہر منظوری ثبت کر دی
رکانگریس (مجلس مشاورت) کا کام ختم نہ ہوا تھا کہ ۹ جولائی کو لندن کے
اخبار گلوب نے اس بھانڈے کو پھوڑ دیا اور خفیہ عہد نامہ کی دفعات کی
اصل عبارت کو شائع کر دیا۔ یہ بات خیال میں بھی نہیں آ سکتی کہ اس شرت
برلن میں سنسنی اب اندر پیدا نہیں ہوئی ہوگی۔ فرانس اور روس نے یہ محسوس
کیا کہ ان کی سخت توہین کی گئی۔ یہ دونوں سفیر صاف اور صریح جھوٹ
کے مجرم ٹھہرے۔ ڈسریلی بیماری کے بہانے صاحب فراش ہو گیا اور

کئی دن تک مجلس میں نہ آیا۔ آخر کار بسمارک نے ڈسریلی کی مدد کی اور مفصلۂ ذیل تصفیہ کیا جس پر فرانس اور انگلستان دونوں رضامند ہو گئے۔

۱۔ کہ فرانس کو اجازت ہے کہ قبرس کے معاوضہ میں جیسے ہی اس کو پہلا مناسب موقع ملے ٹیونس پر قبضہ کرے۔ انگریز اس کی کوئی مخالفت نہ کرینگے۔

۲۔ کہ انگریز شام میں فرانس کے خاص حقوق تسلیم کرتے ہیں۔

۳۔ یہ کہ مصر کے مالی انتظام میں فرانس کو بھی انگریزوں کے برابر حق ہو گا۔

مسٹر بلنٹ جو آزادیٔ اقوام کے بڑے حامی ہیں اور جن کی نسبت ایک مرتبہ فریڈرک ہیریسن نے لکھا ہے کہ "آخر انگلستان کا ضمیر ان کے اور ان کے یادگار کے شکریہ کا گہرا بوجھ محسوس کرے گا۔" کہتے ہیں[۱] کہ "وہ تمام جرائم جن کا ارتکاب شمالی افریقہ اور مشرق کی آزادی سلب کرنے کے لئے کیا گیا ہے اور جن کو ہماری نسلوں نے دیکھا ہے ان میں سے آدھے بالواسطہ یا بلاواسطہ قبرس کی سازش سے تعلق رکھتے ہیں۔" اس طرح قلم کی ایک ہی جنبش سے انگلستان نے اپنے حلیف سلطان کے دو نہایت زرخیز صوبے فرانس کے سپرد کر دئے۔ ۱۸۹۷ء کی روم و یونان کی جنگ میں زار نکولس کو سخت حیرت ہوئی اور انگریزوں کو بہت ہی رنج ہوا۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ترکی فوجوں کے مقابلہ میں یونان کی حب الوطنی نے کچھ کام نہیں کیا اور ترکوں نے رفتہ رفتہ اُس بغاوت کو کچل ڈالا اور حکومت دوبارہ

[۱] سیکرٹ ہسٹری مصنفہ مسٹر بلنٹ صفحہ ۳۴-۲۷۔

قائم کردی۔ ان کی فوجیں اینتھنز میں داخل ہو چکی تھیں اور ہلال کو ہر جگہ فتح و نصرت حاصل ہو چکی تھی کہ یکایک اتحادی بیڑہ جہازات جس میں انگریز سب سے پیش پیش تھے اس منظر پر نمودار ہوا اور ترکی بیڑہ کو نیوارینو میں تباہ کر دیا۔ ترکی کی اس عظیم الشان مصیبت کو لارڈ بروگھم نے ایک شاندار اور غیر فانی کام قرار دیا اور لارڈ جان رسل نے ایک عظیم الشان فتح کے نام سے موسوم کیا ہے۔

۱۸۸۲ء کے انگریزی قبضہ مصر کی داستان (جو ابھی تک ترکی کی حکومت کا ایک صوبہ تھا) ایک ہولناک جرم ہے جو انگریزی تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ ایک نہ مٹنے والا داغ رہیگا۔ مسٹر لوئس اپلیٹن جو معاملات خارجہ میں مستند مانے جاتے ہیں کہتے ہیں "انگلستان بلاشبہ زیادتی پر تھا، اس سے کون انکار کرے گا کہ حکومت مصر نے اپنے جائز حقوق کے اندر اسکندریہ کی حفاظت کے لئے اپنے قلعے تعمیر کئے تھے"۔ قبل اس کے کہ مصریوں کی طرف سے کچھ زیادتی ہو انگریزی جنگی جہازات مصری سمندر میں لنگر انداز ہو گئے اور مصری حکومت کو الٹیمیٹم دیدیا۔

یہ فعل بجائے خود اعلان جنگ تھا اور اس لئے انگریزوں نے جنگ شروع کر دی۔ اسکندریہ میں یورپینوں کا قتل نہ صرف انگریزی جہازات کی آمد اور اعلان جنگ کے بعد ہوا بلکہ یہی دونوں باتیں اس قتل کا باعث ہوئیں۔

مسٹر گلیڈسٹون سے جب دار العوام میں سوال کیا گیا کہ اعلان جنگ کس کو دینا چاہیے۔ سلطان کو یا خدیو کو یا عربی پاشا کو۔ تو اُنھوں نے جواب دیا۔ کوئی جنگ تو ہی نہیں اسکندریہ کی گولہ باری ایک حفاظتی تدبیر ہے اور انگریزی جہازات کا یہ فعل صرف مدافعانہ ہی نہ کہ اعلانِ جنگ لیکن بلاشبہ اس مدافعانہ فعل کی بدولت نہ صرف ایک قدیم شہر تباہ و برباد ہوا بلکہ اس کے بعد ہی مصر پر حملہ شروع ہوا سوڈان پر چڑھائی کی گئی اور چالیس ہزار دلیر انسان جو اپنی آزادی کی کوشش کر رہے تھے شہنشاہیت کی دیوی کی قربانگاہ پر چڑھا دیئے گئے۔ تاہم بقول مسٹر گلیڈسٹون یہ جنگ نہ تھی صرف ایک مدافعانہ فعل تھا۔

مسٹر گلیڈسٹون کی ایمانداری اور راستبازی پر اس ہولناک واقعہ کا کچھ اثر نہ پڑا۔ ہاں البتہ جان برائٹ نے جو اس کی وزارت کا ایک ممبر تھا علی الاعلان کہا کہ انگلستان نے قانون بین الاقوام اور معاہدات دونو کی خلاف ورزی کی ہے اس نے عوام کا اعتبار کھو دیا ہے اور اقرار ناموں کو توڑ ڈالا ہے۔

ان ضمانتوں اور وعدوں کی بابت جو برطانوی حکومت نے وقتاً فوقتاً مصر کو جلد سے جلد خالی کرنے کی بابت کیے ہیں جس قدر کم کہا جائے بہتر ہے ایک مرتبہ گلیڈسٹون نے کہا کہ بلاشبہ[1] دنیا کی تمام چیزوں میں مصر کا غیر معین

[1] دارالعوام میں مسٹر گلیڈسٹون کی اسپیچ ۱۰۔ اگست ۱۸۸۲ء

قبضہ ایک ایسی چیز ہے جس کے کرنے پر ہم طیار نہیں ہیں۔ یہ ہز مجسٹی کی حکومت کے تمام اصولوں اور ان وعدوں کے خلاف ہوگا جو ہم نے یورپ سے کئے ہیں"۔ اور اس کے دو برس کے بعد لارڈ گرینول نے کہا کہ "ہز میجسٹی کی حکومت نے یہ تصفیہ کر لیا ہے کہ افواج ۱۸۸۸ء کے شروع میں واپس کر لی جائیں"۔

باوجود اس قسم کے بہت سے وعدوں اور ضمانتوں کے "مصر کا غیر معین قبضہ" برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ گزشتہ جنگ میں الحاق کے لئے بہانہ ڈھونڈھ کر مصر کو شہنشاہیت میں ضم کر لیا گیا۔

کسی قوم کے شہنشاہانہ برتاؤ کی تاریخ میں یقیناً ایسے صاف اور صریح وعدے اور ضمانتیں جو بعد میں اس طریقے سے توڑے جائیں نہ ملیں گے۔ اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جنگ ہوئی جس میں ترکی فوجوں کی یہ حالت تھی کہ گویا وہ ہر چیز کو جو ان کے سامنے آئے گی بہا لے جائیں گی اور قریب تھا کہ وہ یونانی دارالسلطنت کو لے لیتیں اگر ان کی فاتحانہ رفتار کو دول یورپ نے بسرکردگی انگلستان نہ روک دیا ہوتا۔ تھسلی یونان کو واپس دیا گیا اور جزیرہ کریٹ کے انتظام کے لئے ایک یونانی گورنر مقرر کیا گیا۔ یہ انصاف تھا جو ترک فاتحوں کے ساتھ کیا گیا۔ اُس وقت برطانوی وزیر اعظم نے مسٹر ایسکوئتھ کی طرح جنگ بلقان میں یہ اعلان نہیں کیا کہ "فاتح کو اس کی مفتوحات کے ثمرہ سے

لے لارڈ گرینول کی مصری مراسلت نمبر ۲۳ مئی ۱۳ - ۱۹ جون

محروم نہیں کرنا چاہیے" یہ انگلستان ہی تھا جس نے ۱۹۰۴ء کے اتحاد کی رو سے فرانس کو مراکش میں آزادانہ کارروائی کرنے کا اختیار دیا۔ بلاشبہ مراکش کچھ انگلستان کی ملک نہ تھا کہ وہ یوں فرانس کو دیدے لیکن دول عظام کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ دوسری اقوام کے املاک نہایت فیاضی اور سخاوت سے تقسیم کرتے ہیں۔ مفت بخشی کی یہ داستان طرابلس کی جنگ میں پھر دُہرائی گئی۔ انگلستان غالباً اپنے قبضۂ مصر کی وجہ سے ۱۹۰۲ء ہی میں اٹلی کے الحاق طرابلس کو منظور کر چکا تھا۔ اٹلی نے بے سمجھے بوجھے سلطان کے اس افریقی صوبہ پر چڑھائی کر دی۔ انگریزوں نے نہ صرف اس جرم سے چشم پوشی کی بلکہ جیسا فورٹ نائٹلی ریویو[۱] میں لکھنے والا اقرار کرتا ہے۔ برطانوی محکمۂ خارجہ خود اس سازش میں شریک تھا۔

اس مضمون کا لکھنے والا کہتا ہے کہ "اس میں بہت کم شک کی گنجائش ہے کہ کچھ نہ کچھ سمجھوتہ ہو چکا تھا۔ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان اس بات پر راضی ہو گیا تھا کہ وہ ترکی فوجوں کو مصر سے نہ گزرنے دیگا اور جہانتک ممکن ہوگا آلات حرب اور دیگر سامان جنگ کو بھی اس راستہ سے نہ گزرنے دیگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ بھی ذمہ داری لی تھی کہ وہ مصر کو بالکل غیر طرفدار رکھے گا اور باب عالی کو اپنے ماتحت (مصر) سے کوئی امداد نہ لینے دیگا۔"

لڑائی شروع ہونے کے ساتھ ہی لارڈ کچنر کا مصر بھیجا جانا محض حسن اتفاق

[۱] فورٹ نائٹلی ریویو مارچ ۱۹۱۲ء۔

سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ قاہرہ میں لارڈ کیچنر کا کام یہ تھا کہ
وہ کسی عثمانی فوج کو مصر سے نہ گزرنے دیں اور دوسرے مسلمان طرابلس کے
مسلمانوں کو کسی قسم کی مدد نہ پہنچائیں۔ لارڈ کیچنر نے اس خیال سے کہ کہیں
ایسا نہ ہو کہ ترکی فوجیں طرابلس جاتے ہوئے وادی نیل سے گزرنے کا مطالبہ
کریں اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے نہر سویز کے مشرقی جانب ریگستان میں
برابر قلعوں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ
اگر ترکی فوجوں کو مصر ہو کر راستہ مل گیا ہوتا تو طرابلس اٹلی کا صوبہ نہ ہوتا؟
یہ یقین کیا جاتا ہے کہ یہ بالواسطہ مگر موثر مدد اٹلی کو سر اڈورڈ گرے
نے اس مفاہمت پر دی تھی کہ اگر یورپ میں کوئی باہمی کشمکش ہو تو اٹلی کا
طرزِ عمل انگریزوں کے ساتھ دوستانہ رہیگا۔ اس قیاس کے واقعات مابعد
سے تصدیق ہوتی ہے یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ مذکورہ بالا مضمون نگار
نے جو الزامات لگائے ہیں اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو اس کی آج تک
تردید نہیں کی گئی اور ترکی حکومت کو بلقان میں جو مصیبت پیش آئی اور پھر
ہز مجسٹی کی حکومت کے ذمہ دار وزراء نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور
اس بربادی اور تباہی پر جس قدر غیر محدود مسرت و شادمانی دکھائی ہے
وہ ابھی ہمارے ذہنوں میں تازہ ہے اور اس کی یہاں ذکر کرنے کی ضرورت
نہیں ہے۔ ترکی سے انگلستان کے تعلقات کی داستان اس قدر صاف نہیں ہے

جس قدر کہ عام طور سے خیال کی جاتی ہے برطانیہ اعظم کی گزشتہ
تاریخ کے سرسری مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انیسویں صدی
کے دوران میں ترکوں کو جو کچھ نقصان پہنچا ہے وہ بالواسطہ یا بلا
واسطہ انگلستان ہی کے ذریعہ سے پہنچا ہے۔

اب موجودہ زمانہ پر نظر ڈالتے ہوئے ہم کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ ذلت
آمیز عہد نامہ جو انگلستان اور ایران میں ہوا تھا اس کی ابتدا انگلستان ہی
کی طرف سے ہوئی تھی اور ہم کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ انگلستان ہی نے
[illegible] اور فلسطین پر بھی انگلستان ہی کا قبضہ ہے
آذربائیجان کی جمہوری سلطنت کو اپنے زیر حفاظت لانا انگلستان کی
دیرینہ تمنا ہے قسطنطنیہ میں بھی انگریزوں کا دخل ہے۔ وہ انگلستان
ہی تھا جس نے کہ شریف حسین کو خلیفہ کے خلاف بغاوت کرنے
کے لئے رشوت دی۔ ان سب باتوں پر غور کرتے ہوئے اگر مسلمان اپنی
بدقسمتی کو انگلستان کی طرف محمول کریں اور اس کو جزیرۃ العرب کا تقدس
قائم نہ رکھنے کا ذمہ دار ٹھہرائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

باب چہارم

جنگ عظیم

۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد ترکوں نے اپنے پرانے حلیف اور دوست

انگلستان سے کیا کیا توقعات قائم کی تھیں اور انگلستان نے نوجوان ترکوں سے کیا برتاؤ کیا؟ یہ ایسی غم انگیز اور اس قدر تازہ داستان ہے جس کا اس رسالہ میں لکھنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انگلستان نے صرف یہی نہیں کیا کہ ترکوں کی پاک خواہشوں سے بے پروائی برتی بلکہ اُنہوں نے جو دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا، اس کے پکڑنے سے بھی انکار کر دیا۔ نوجوان ترکوں کی جماعت نے حالات و واقعات سے تنگ آ کر جب ان کو انگلستان کی طرف سے مایوسی ہو گئی اپنا ہاتھ جرمنی کی طرف بڑھایا۔ اور جرمنی نے نہایت خوشی اور مسرت سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔ قسطنطنیہ میں اُس وقت کے انگریزی سفیر کی ناقابلیت طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں برطانوی محکمۂ خارجہ کا طرزِ عمل، ترکی اور دوسری اسلامی سلطنت مراکو اور ایران کے ساتھ جرمنی سفیر متعینہ باب عالی ہر مارشل فان بیبرسٹین کی کامیاب ڈپلومیسی، ولیم قیصر جرمنی کی دوستانہ پالیسی جو اس نے اپنے دادا کی تقلید میں اختیار کی تھی، انگریزی حکومت پر روس کا عجیب و غریب اثر، یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ ترکی پر جرمنی کی شرکتِ جنگ کا الزام لگاتے ہوئے نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔

معاملات کی یہ حالت تھی کہ عظیم الشّان جنگ یورپ شروع ہوئی

ہندوستان کے مسلمانوں کی دلی خواہش یہ تھی کہ ترک اس جنگ سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔ ان کا یہ سچا خیال تھا کہ اگر کہیں ترک اس جنگ میں شریک ہو گئے تو ان کی حالت بہت نازک ہو جائے گی۔ اور ان کی مثال اس دانہ کی سی ہو گی جو چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں دب گیا ہو۔ ایک تار جو محکمۂ خارجیہ ہند نے قابل اور ہر دلعزیز لیڈر محمد علی کی معرفت خلیفۃ المسلمین کے ایک وزیر کے نام بھجوایا تھا جس میں ان سے التجا کی گئی تھی کہ وہ اس عظیم الشان جنگ میں غیر جانب دار رہیں اور شریک نہ ہوں۔ محمد علی نے بلاشبہ اس تار کے بھیجنے میں اپنے ہم مذہبوں کی ترجمانی کی۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ باب عالی پر سے برطانیہ کا اخلاقی اثر رخصت ہو چکا تھا۔ سر ایڈورڈ گرے اپنے طرزِ عمل سے یہ دکھلا چکے تھے کہ ان کو ترکوں کی امیدوں اور تمناؤں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ برطانیہ نے طرابلس اور بلقان کی جنگ میں جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا وہ ترکوں کو اچھی طرح یاد تھا۔ لڑائی کے پہلے انگریزوں نے عدن سے عرب باغیوں کو جو امداد دی تھی اس سے ہر ترک خواہ جنرل ہو یا مدبر اچھی طرح جانتا تھا اور ترک اس سے نہایت ناخوش تھے مسٹر اسکویتھ کا اعلان جو تعصب میں ڈوبا ہوا تھا مسلمانوں کے دماغوں میں ابھی تازہ تھا۔ مسٹر لائڈ جارج نے "ردی پرزہ" پر اپنی مشہور تقریر میں جو انہوں نے لڑائی شروع ہونے کے وقت کی تھی جب کہ ترک شریک جنگ بھی نہیں ہوئے تھے رسول اکرم روحی فداہ کا ذکر نہایت حقارت سے کیا۔ اور قیصر جرمنی کا آپ سے

مقابلہ کیا۔ ایسے وزراء سے جنہوں نے اُن کے مذہب کی انتہائی تحقیر کی تھی ترک
بھلا کیا امید کر سکتے تھے۔ بلقان کی جنگ شروع ہونے کے چند ہی ہفتے پیشتر
ہز مجسٹی کی حکومت کے مشورہ اور ضمانت پر کامل پاشا نے فوج کا ایک بڑا حصہ
منتشر کر دیا تھا۔ یہ تمام باتیں ابھی تازہ تھیں۔ ابھی تو اُس کاغذ کی سیاہی بھی
خشک نہیں ہوئی تھی جس پر جنگ طرابلس اور بلقان کا معاہدہ صلح لکھا گیا تھا
انگلستان پر سے ترکوں کا اعتبار اُٹھ جانا یہ کوئی غیر فطرتی اور بلا سبب نہ تھا
ان کا یہ اندیشہ بالکل بجا تھا کہیں روس کا قسطنطنیہ اور باسفورس پر قبضہ
کرنے کا پرانا خواب لڑائی کے بعد پورا نہ ہو جائے۔ ترک روس کے مقابلہ میں
انگلستان کی امداد پر زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ترکوں کی قوت فیصلہ
کی غلطی ہو کہ وہ لڑائی میں شریک ہوئے لیکن یہ کہنا کہ ٹرکی کا جرمنی کی شرکت
کرنا بالکل بے سبب تھا اس بات کا دعویٰ کرنا ہے کہ ایسی رائے رکھنے والا اس
زمانہ کے واقعات سے قطعی لاعلم ہے۔

ترکوں کا یہ اندیشہ کم نہیں ہو سکتا تھا جبکہ حالت اس درجہ تک پہنچ گئی
تھی کہ برطانیہ نے ان کے دو بڑے جہازوں کو ضبط کر لیا تھا اور یہ جہاز بھی یونانی
بیڑے کے مقابلہ میں ترکوں کے لئے پشت پناہ تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ انگریزوں
کے اس فعل نے ترکوں کے فیصلہ پر بہت اثر ڈالا۔ ان کے جہازات کا لے لینا
کیا نا انصافی نہ تھی؟ اور یہ بات غور طلب ہے کیا اتحادیوں نے جنرل بوش کو لیا

کو کوئی اطمینان دلایا تھا کہ ان کے مقبوضات برقرار رکھے جائیں گے؟
گو وزیر اعظم نے یہ کہا ہے کہ ترکوں کے شریک جنگ ہونے سے پہلے بھی
اتحادیوں میں ترکی کے متعلق کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا لیکن اس سے ہماری
بحث کا تصفیہ نہیں ہوتا ہم اپنی بحث کی تائید میں مسٹر ہیرلڈ کاکس کو جو
انگریزی سیاست کے ماہرین میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں پیش کرتے ہیں
ایڈنبرا ریویو میں اپنے ایک مضمون میں اُنہوں نے لکھا ہے کہ ترکی حکومت نے
اتحادیوں سے ضمانت چاہی لیکن روسی حکومت نے کسی ضمانت کے دینے
سے انکار کیا۔ ... یاد رکھنا چاہیے ترکی حکومت کو روس کا بہت خوف تھا
اس رپورٹ کے مطالعے سے بھی جس کو امریکہ کے سابق سفیر پیرس مسٹر ای شیر
پرائٹ نے ۱۹۱۷ء میں امریکہ کے سکرٹری آف اسٹیٹ کو بھیجی تھی یہ بات
ثابت ہوتی ہے کہ اتحادیوں کے خلاف ترکی کی شرکت جنگ کی ذمہ داری
ترکی سے زیادہ اتحادیوں پر عاید ہوتی ہے جب ترکی ایک مرتبہ جنگ میں شریک
ہوگئی تو یکایک بحر اسود کے دروازوں کا اپنے ایک پرانے مددگار پر بند کر دینا
کوئی جرم نہیں ہے اور اس کو اس بنا پر سزا نہیں دی جا سکتی۔ اگرچہ اس کا
بہت افسوس کیا جاتا ہے کہ اتحادیوں کو بحر اسود میں جانے کا آزادانہ راستہ
نہ دیا گیا لیکن جب ہم ترکوں کو اس بات کی سزا دینا چاہتے ہیں کہ کیوں اُنہوں
نے آزادانہ راستہ دینے سے انکار کیا تو ہم کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ قانون

بین الاقوام یا فلاں معاہدہ کی رو سے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا جہاں تک ہم جانتے ہیں کوئی ایسا معاہدہ نہیں ہے جس کی رو سے وہ ایسا کرنے کے پابند ہوں۔ وزیر اعظم فرماتے ہیں کہ "اب ترکی کو شکست ہو گئی۔ اتحادیوں کا طرز عمل کیا ہو؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اتحادی ایک خاص مقصد کے لئے شریک جنگ ہوئے تھے اور جس کا اُنہوں نے تمام دُنیا میں اعلان کیا یہی مقصد بعد میں پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ اصولوں کی شکل میں نمایاں ہوا اس لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ ترکی کے مقدمہ کا فیصلہ انہی چودہ اصولوں کے مطابق کرنا چاہئے۔ بیشک ترکی کو شکست ہوئی اور اس لئے کچھ نہ کچھ اسے شکست کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا" جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" یعنی طاقت ہی کا دوسرا نام استحقاق ہے۔ یہ ایک کلیہ ہے موجودہ تہذیب جس کے خلاف ادعا کرتی ہے لیکن وہ باوجود اس ادعا کے بدستور اثر پذیر رہیگا۔

درحقیقت گبن کے قول کے مطابق "جبتک کہ نوع انسان اپنے محسنوں سے زیادہ اپنے تباہ کرنے والوں کی تحسین و آفرین کرتی رہے گی جنگی شوکت و عظمت کے حصول کی ہوس معزز ترین اشخاص کی خباثت کو ثابت کرتی رہیگی" لیکن اس تیل اور کوئلہ کی تہذیب کے زمانہ میں بھی ہم امید کر سکتے ہیں کہ ہمارے افعال کا فیصلہ اخلاق اور نیک نیتی کے ایک مقررہ قاعدہ کے مطابق کیا جائے گا۔ اور جب لوگ محض نیک نیتی کے بھروسہ پر کسی مقصد کے حصول کے لئے

امداد اور اعانت سے دریغ نہ کریں۔ یہاں تک کہ ان کی مدد سے مقصد
پورا ہو جائے۔ اس وقت وہ اور بھی زیادہ ہمدردی اور لحاظ کا استحقاق رکھتے
ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ہز مجسٹی کے
وزرا کے اعلانات اور وعدوں پر پورا اعتماد کیا اور اس امید میں کہ وہ وعدے
جو سنجیدگی کے ساتھ کئے گئے تھے پورے کئے جائیں گے۔ وہ اپنے ہم مذہبوں
کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے گئے۔ اب کامیاب ہو جانے کے بعد ان وعدوں
کی تاویلیں اور توجیہات کی جا رہی ہیں۔ افسوس! اس قسم کے لوگ یہ نہیں
سوچتے کہ اس قسم کے حیلہ وحوالہ سے خود انگلستان کی عزت پر حرف آتا ہے
اور انگلستان کی توہین ہوتی ہے۔ ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ مجلس صلح نے
ٹرکوں کے ساتھ وہی شرائط متعلق کی ہیں جو جرمنی اور آسٹریا کے ساتھ کئے
گئے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ہم شام، عراق اور فلسطین کی حکمبرداری کا حال
بھی سنتے ہیں اور جو کچھ بھی کہا جائے مگر جرمن اور آسٹریا کے شرائط صلح
میں ہم کہیں حکمبرداری نہیں دیکھتے۔ آسٹریا میں مختلف صوبے آزاد کئے گئے
اور ان کو سیلف ڈیٹرمینیشن (اپنے لئے حکومت کا خود انتخاب کرنا) کا حق
دیا گیا برخلاف اس کے ٹرکی کے بھی چند صوبے آزاد کئے گئے اور ان کو عیسائیوں
کے حکمبرداری کے تحت میں رکھا گیا۔ جرمنی اور آسٹریا سے گزر کر ٹرکی تک پہنچتے
پہنچتے (سیلف ڈیٹرمینیشن) کے اصول کے معنی بدل گئے۔ پولینڈ لٹس لیتھونیا

ارمینیا۔ میگیارس، زیکوسلوواکس اور جگوسلوواکس کے متعلق حکومت کے
انتخاب کا حق خود ان اقوام کو دیکر سلیف ڈیٹرمینیشن کے اصول کو پورا کیا گیا
لیکن ٹرکی کے مقابلہ میں شام کی حکومت کا حق انتخاب فرانس کو۔ اڈالیہ کا
اٹلی کو۔ سمرنا اور تھریس کا یونان کو۔ فلسطین اور عراق کا انگلستان کو اور
سلیشیا۔ اناطولیہ اور قسطنطنیہ کی حکومت کا حق انتخاب انہیں اقوام کو دیکر
نفی سلیف کا منشا پورا کیا گیا۔ یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ یہ کلی طور سے انہیں
اقوام کے حق انگلستان۔ فرانس اور اٹلی کے ہیں اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ
ترکی میں انتخاب حکومت صوبہ وار نہیں بدلتا۔ بلکہ مذہب کے مطابق اس میں
تبدیلی ہوتی ہے۔ عیسائی آرمینیا کو آزادی ملنا چاہئے مگر مسلم عربوں کو
صرف حکمبرداری پر قناعت کرنا چاہیئے۔ وزیر اعظم نے دارالعوام میں آئرش
بل پر جو تقریر کی ہے اس میں اصول حق انتخاب حکومت کے ایک نئے معنی
بیان کئے ہیں۔ اس موقعہ پر وزیر اعظم فرماتے ہیں کہ اس کے معنی یہ نہیں
ہیں کہ ملک کے ہر ایک حصہ کو جو صدیوں سے مل جل کر کام کر رہا ہو ایک الگ
جمہوریت قائم کرنے کا حق ہو کسی اصول کے استعمال کرنے میں اس تحدید کا
لحاظ رکھنا چاہیئے۔ اگر یہ حالت ہو تو کیا ترک اس حق کا مطالبہ نہیں کر سکتے
وہ صدہا سال سے ٹرکی میں ہیں۔ ایک اور موقعہ پر وزیر اعظم ایک قدم اور
آگے بڑھ گئے اور انہوں نے حق انتخاب حکومت" اور موصل کے تیل کے چشمے کو ایک کر دکھایا

تھریس اور سمرنا اور دوسرے حصّوں کی یونانی[1] اور ارمنی آبادی کے اعداد کا اُلٹ پھیر اس قدر مضحکہ انگیز ہے کہ کوئی مصنّف ایماندار آدمی اُس پر لحاظ کرنا بھی گوارا نہ کرے گا۔ ایک سنک[2] Cynic نے ایک مرتبہ یہ بات کہی کہ خدا نے انسان کو زبان صداقت کے چھپانے کی غرض سے دی ہے نہ کہ اس کے ظاہر کرنے کو۔ ترک فطرتاً بردبار واقع ہوئے ہیں۔ ان کا تسامح اور تحمّل اپنی عیسائی رعایا کے ساتھ ضرب المثل ہے۔ تمام تکلیفیں اور مصیبتیں جو ترکی میں پروٹسٹنٹ مشنوں کو برداشت کرنا پڑیں اُسکے بانی عیسائی (رومن کیتھولک پادری مختلف عیسائی جماعتیں اور مختلف العقائد عیسائی فرماتے ہیں:۔

ارمنی زبان ارمنی مذہب ارمنی مدارس ترکی میں بالکل آزاد تھے۔ طرابزون سے ارض روم جانے والی سڑک پر جا بجا عیسائی خانقاہیں بنی ہوئی ہیں مسٹر سڈنی وٹمین لکھتے ہیں کہ میں نے بیشمار ارمنیوں اُن کے پادریوں اور تمام اضلاع کے بشپوں سے گفتگو کی سب نے مجھے یقین دلایا کہ ان اضلاع میں کسی قسم کی چھیڑ اور زیادتی ہم پر نہیں کی گئی، نہ کسی قسم کی تکلیف دی گئی۔ اگرچہ اطراف میں انقلابی جماعتیں پھیلی ہوئی تھیں"۔ وان فلپس کہتا ہے کہ رومن کیتھولک

[1] سنہ ۱۹۱۲ء کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مردم شماری قبل جنگ حسب ذیل ہے

ولایت ادرنہ	مسلم ۵۶۰۰۰۰	یونانی ۲۲۴۰۰۰	ارمنی ۱۵۰۰۰
ولایت سمرنا	مسلم ۱۲۴۹۰۰۰	یونانی ۲۹۹۰۰۰	ارمنی ۲۰۰۰۰

عیسائی روئیں گے اور خوف سے تھر تھر کانپیں گے اگر وہ ترکی ہلال کے سایہ سے نکل کر روسی عقاب کی ماتحتی میں رہنے جائیں گے"

عالی جناب چیڈو سلوج جو سینٹ جیمس کے دربار میں پہلے سروی سفیر تھے۔ اب کہ سرویا نے اپنی تمناؤں کو جہاں تک کہ اُن کا تعلق ترکی سے تھا حاصل کر لیا ہے صاف صاف اقرار کرتے ہیں کہ سیاسی مفاد کی بنا پر ہم (اقوام بلقان) ترکوں کو بیرحم ایشیائی ظالم یورپ کی تہذیب کے ناقابل کہتے تھے۔ اگر ہم تاریخ کو منصفانہ نظر سے دیکھیں تو یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ترک ایشیائی ہونے سے زائد یورپین ہیں وہ بیرحم ظالم نہیں ہیں بلکہ ایک ایسی قوم ہیں جو انصاف اور راستبازی کو پسند کرتے ہیں جن میں بہت سی ایسی صفات اور خوبیاں ہیں جو اس کی مستحق ہیں کہ صدق دل سے ان کا اقرار کیا جاوے اور ان کی عزّت کی جاوے" بلاشبہ شرافت تُرکوں کی سرشت میں ہے نہ صرف یہ کہ وہ ایک شریف قوم ہیں بلکہ دماغی حیثیت سے بھی ذہین اقوام میں ان کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان کے اخلاق اور عادات ایسے نہیں ہیں کہ ان سے نفرت کی جائے۔ حاجی خلیفہ کوچی بیگ سعد الدین اور اُن کے علاوہ اور بہت سے لائق لوگ ہیں جو تُرک تھے۔

وہ بجائے اس کے کہ ترکوں پر فنون لطیفہ یا علم ادب سے بے توجہی کا الزام عائد کیا جاوے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ صفحۂ دُنیا پر شاید ہی کوئی ایسی

قوم ہو گئی جس نے علوم عامہ کے حصول میں ترکوں سے زیادہ امتیاز پیدا
کیا ہو[۱]۔ باب عالی کے ساتھ دول یورپ کا سلوک ہمیشہ یکساں طور پر
خود غرضانہ رہا ہے۔ ترکوں کو کبھی بھی اصلاح حال کا موقع نہیں دیا
گیا اور نہ کبھی ان کو گزشتہ صدی میں ایمانداری سے شکست دی گئی ہے[۲]۔

باب پنجم

خاتمہ

کہا جاتا ہے کہ انگلستان نے اس لئے جنگ کی کہ جرمنی بلجیم کی غیر
جانب داری کے بارے میں اپنے وعدہ پر قائم نہیں رہا لیکن کیا یہی
اصول انگلستان کی نسبت نہیں استعمال کیا جا سکتا جس نے ترکی کے
مستقبل کے بارے میں اطمینان دلایا اور وعدے کئے ایشیا میں برطانوی

---

[۱] ٹاڈیرینی ڈی لا لٹریچر دس ٹیورس حصہ اول صفحہ ۴۔

[۲] لین پول کی تاریخ ترک۔

قوت کو اس سے زیادہ نقصان پہنچانے والی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ انگلستان کے الفاظ پر سے لوگوں کا اعتماد جاتا رہے انگلستان کے لئے یہ ایک مہلک شہرت ہے۔ سب سے اعلیٰ اصول یہ ہے کہ "لوگوں کو ہمیشہ سچائی اور راستبازی پر قائم رہنا چاہیئے۔ چاہے آسمان بھی گر پڑے"[1] یہی اصول سچی عظمت کا جوہر ہے۔

کسی قوم کی جانچ اکثر اُس کے لیڈروں کے افعال اور اعمال سے کی جاتی ہے۔ قوم کے بڑے بڑے لوگوں کے اقوال درحقیقت اس قوم کے خیالات کا عکس ہوتے ہیں اور ہم اسکے رؤسا اور سرداروں کے اعمال سے اس کُل قوم کا اندازہ کر سکتے ہیں اور اگر اس وقت مدبرین انگلستان کے افعال و اقوال انگریزی قوم کے خیالات کا عکس ہیں تو انگلستان کم از کم اخلاقی حیثیت سے دُنیا کی نظروں میں ذلیل ہو چکا لیکن افسوس کہ قوموں کی کشمکش میں انسانیت کے اصول کا بہت کم لحاظ کیا جاتا ہے اور "تیل" اور "کوئلہ" کا لحاظ تمام بہترین خیالات (Idealism) کو نیچے ڈال دیتا ہے۔ بلاشبہ انگلستان اپنی مادی شوکت اور عظمت کے انتہائی عروج پر پہنچ گیا ہے اپنے خطرناک دشمن جرمنی پر فتح پاکر مدہوش ہوگیا ہے لیکن اس کے اندرونی اور بیرونی خطرے ابھی ختم نہیں ہوئے ہیں۔ انگلستان کے مدبرین ان

[1] تاریخ کی مصالحت صفحہ ۹۔

نمایاں خطروں سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ اس قسم کے وسیع مسائل کا عالمانہ مطالعہ کرنے کے وقت ہم کو اخبارات کے روزمرہ کے اس طرزِ تحریر کو جس میں وہ اس معاملہ کے روشن پہلو دکھاتے ہیں احتیاط کے ساتھ نظرانداز کر دینا چاہیے۔

شکست خوردہ قوموں کے ساتھ جو شرائط صلح کی گئی ہیں اُن سے دُنیا میں پائدار امن قائم نہیں رہ سکتا۔ علاوہ بریں جنگ کے نتائج نے بھی دوسری اقوام میں انگلستان کے خلاف حسد پیدا کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ خود انگلستان کے حلیف بھی دل میں خوش نہیں ہیں۔

پھر امریکہ اور جاپان کی آنیوالی جنگ کی لپیٹ میں انگلستان کا آنا یقینی ہے۔ جرمنی بدلہ لینے کے لئے دوسری جنگ کی تیاری کر رہا ہے بالشویک انگلستان کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں اور اس لئے سب سے پہلے انگلستان کا قصہ پاک کر دینا چاہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنیوالی عالمگیر جنگ کا میدان ایشیا ہوگا انگلستان اس جنگ میں اس سے زیادہ مہیب طریقہ سے مبتلا ہوگا جتنا وہ گزشتہ جنگ جرمنی میں ہوا تھا انگلستان کے پاس آئندہ جنگ کرنے کا کیا سامان ہے۔ کیا وہ اپنے متعدد دشمنوں سے بے چین ہندوستان اور مخالفِ اسلام کو لیکر جنگ کریگا۔ اس کو ہندوستان اور اسلام کے ذرائع سے متمتع ہونے کی ضرورت ہوگی بالخصوص

اُس کے آدمیوں کی انگلستان کی مخالفت میں جو طاقتیں بھی متحد ہوں
دوستِ ٹرکی" اور شکر گزار ہندوستان اس کے جواب کے لئے کافی
ہوتی۔ ترکوں کو عاجز کر دیا گیا ہے۔ ایرانی انتشار کی حالت میں ہیں۔ مصر
مراکش اور طرابلس یورپ کے زیر اثر ہو چکے ہیں۔ لیکن اسلام ابھی ایک زندہ
قوت ہے وہ اب سو نہیں رہا ہے اور اگر کوئی عقلمند سمجھدار لیڈر پیدا ہو
جائے تو وہ اب بھی لویالہ اور بورومیو کی طرح کامیابی حاصل کر سکتا ہے
کہا جاتا ہے کہ موجودہ امیر افغانستان نے یہ الفاظ کہے ہیں کہ "میں نے
برطانوی حکومت کو لکھدیا ہے کہ کوئی مسلمان بھی کسی حالت میں اس کو نہیں
برداشت کر سکتا کہ مسئلہ خلافت میں کسی قسم کی بھی دست اندازی کیجاوے یا خلیفہ پر
کسی قسم کی بھی نگرانی قائم کی جاوے اگر وہ مسئلہ خلافت میں افغانستان کی دوستی
کا کچھ لحاظ نہیں کرتے تو وہ سلطنت کے استحکام کو خطرے میں ڈالتے ہیں
امان اللہ اسلام کے راستہ میں اپنی جان قربان کرنیکے لئے تیار ہے"۔ اعلیٰ حضرت
حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہٗ نے بھی وزیر ہند کو مسئلہ خلافت کے بارہ میں
کچھ کم زوردار الفاظ میں نہیں لکھا تھا۔ کیا برطانوی حکومت ایسے وزنی
اعلانات کو جو مسلمان رؤسا، اُس کے دوست اور مددگاروں کی طرف سے
ہوئے ہیں نظر انداز کر سکتی ہے؟ نجف اشرف اور کربلائے معلےٰ کے
مجتہدین عظام نے فتوے دئے ہیں کہ ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ وہ اسلام
کی قطع و برید اور جزیرۃ العرب یا اُس کے کسی حصہ کو غیر مسلم کے قبضہ میں

جانے سے روکے چاہے حکمرداری کی شکل میں یا دوسری شکل میں[1] مقبوضہ عراق کے لوگوں نے بھی صاف صاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ ہم صرف سلطان روم کو خلیفہ مانتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ہمارا مذہب اسلام یا خلافت کی قطع برید کی اجازت نہیں دیتا۔ ان پُر زور صاف رایوں اور اعلانوں کی تحقیر نہیں کی جاسکتی۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ جنگ صلیبی تھی تو اس کا الزام خود وزیر اعظم انگلستان پر ہے یہ یاد ہوگا کہ انہوں نے لارڈ النبائی کو ایسا ہیرو کہا جس نے وہ چیز حاصل کی جس کی تمام عیسائی دنیا صدیوں کی کوششوں کے باوجود بھی حاصل کرنے سے محروم رہی۔ ایک دوسرے وزیر مسٹر چرچل نے کہا ہے کہ یہ ترکوں کے خلاف ایک صلیبی جنگ تھی انگلستان اپنے آٹھ کروڑ رعایا کے جذبات اور احساسات سے زیادہ دنوں تک بے پروائی نہیں برت سکتا۔

کیا درحقیقت انگلستان نے اپنی مضبوط سیاسی قوت مدرکہ جو اس قدر مدت تک اس کی سپر رہی کھو دی ہے؟ کیا اس کا احساس عزت بھی جاتا رہا ہے؟ مسٹر ولفرڈ اسکوون بلنٹ فرماتے ہیں "ہم ناکامیاب ہو رہے ہیں کیونکہ اب ہم ایماندار منصف اور شریف نہیں رہے ہیں۔ یہ ہماری سخت محنت شدید احساس اور انتہائی عزت کی وجہ تھی کہ ہم دنیا میں اس مرتبہ کو پہنچے۔

---

[1] مسلم آؤٹ لک ۳ جون ۱۹۲۰ء [2] "الظہور" جو بغداد سے شائع ہوتا ہے۔

اب یہ تمام باتیں ہم سے جا چکی ہیں اس لئے ہم اس کا قدرتی خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ ایک صدی تک ہم دنیا میں بھلائی کرتے رہے اور ایک ہی صدی تک ہم برائی کریں گے۔ اس کے بعد دنیا ہمارا ذکر نہ سُنے گی۔"

ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ خلافت ایک قدیم چیز ہے اور یہ اسلام کا ایک نہایت اہم مسئلہ ہے اس کو ناچیز نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہمارے حکمرانوں کو واقعات سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے۔ انہوں نے غیر اقوام کی ایک بڑی تعداد پر حکومت کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے اس لئے اُن کو اپنے ارادوں میں فیاضی برتنی چاہیے۔ لوگوں کے جذبات بہ نسبت اُن کی فہم کے بہت جلد اثر پذیر ہو جاتے ہیں۔ تدبّر کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کی قومی خصوصیات کا جس حالت میں بھی ہوں لحاظ رکھنا چاہیے۔ انگریز جو صرف اپنے ہی وجوہ اور دلائل پر عمل کرنے کے عادی ہیں وہ اس بات کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے کہ کس خیال کا مشرقی دماغ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ انگریزوں کی قومی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جلد کسی خیال سے متاثر نہیں ہوتے۔ نپولین نے خود اس کی شکایت کی ہے کہ یورپ کے سپاہیوں میں کسی خیال کے ذریعہ سے جوش پیدا کر دینا اسی حیثیت سے غیر ممکن ہے۔ نپولین نے جب مصر پر حملہ کیا متعدد مرتبہ اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ "کاش میں مشرق میں اور آگے بڑھتا اور اپنے سر پر پگڑی رکھ کر ایک نئی سلطنت قائم کرتا۔" ہمیں امید ہے کہ اب بھی

انگریزوں کی موجودہ نسل مشرق کی سریع الحسی اور قوت جذبہ
کے اثر کو اس سے زیادہ سمجھے گی جتنا کہ نپولین نے ایک سو سال پہلے
سمجھا تھا۔ ہم بھی امید کرتے ہیں کہ بادی عقیدہ جبریہ کے ماننے والے
مشرق کے سریع الحسی کے موثر عنصر کو فراموش نہ کریں گے۔ اگر انگلستان
میں تمام سے اتحاد عمل کا خیال پیدا ہو جائے اور وہ ہندوستان کو
آزاد کر دے تو انگلستان کی آئندہ عظمت و شوکت یقینی ہے اور تاریخ
میں اس وقت بھی اس کی یادگار باقی رہے گی جب تک کہ سلطنت اور
شوکت فنا ہو چکی ہو گی۔ جرمنی کا تنزل ایک اعلیٰ سبق سکھاتا ہے جس سے
کہ اور سلطنتیں عبرت حاصل نہیں کرتیں وہ یہ ہے کہ اسلحہ اور دولت
نہایت ہی کمزور ذریعہ حفاظت ہیں اور یہ کہ ایک قوم کو اگر وہ تمام دنیا
بھی فتح کر لے کچھ فائدہ حاصل نہ ہو گا اگر ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی روحانیت
کو کھو بیٹھے۔

تھریس اور سمرنا اس کے جائز مالکوں کو واپس دیدینا چاہئے
عراق فلسطین اور شام کی حکمبرداری کا ذکر چھوڑ دینا چاہئے اگر یہ ممالک
خواہش کریں تو ان کو خلیفہ کی موثر ماتحتی میں حکومت خود اختیاری دینی
چاہئے۔ ٹرکی حکومت پر کوئی مالی اقتدار قائم نہ رکھنا چاہئے خلاصہ یہ کہ ٹرکی
کا جائز وجود قائم رکھا جائے۔ مگر افسوس کہ سرکار برطانیہ کے کسی طرز عمل

سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ان مطالبات میں سے کوئی مطالبہ بھی پورا کرے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ وزیر اعظم برطانیہ نے سیورس کے صلح نامہ کی ترمیم کی سختی سے مخالفت کی ہے حال ہی میں ٹائمس نے یہ زہر اگلا ہے کہ ٹرکی سے ہندوستان یا کسی دوسرے ملک کے ساتھ کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا اور آگے چل کر وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ وزیر اعظم نے تھریس قسطنطنیہ اور دیگر مقامات کے متعلق جہاں ترک کثرت سے آباد ہیں جو کچھ کہا ہے وہ ٹرکی کے لیے ایک قسم کے اُن شرائط کی اطلاع تھی جس پر وہ اُس وقت صلح کر سکتی تھی مگر یہ شرائط بے اثر ہوگئیں جبکہ اُن کو نہیں مانا گیا۔ یہ واقعات کو ایک غلط پیرایہ میں ظاہر کرنا ہے۔ بہتر ہے کہ مسٹر لائڈ جارج خود اس کا جواب دیں۔ ۲۶ فروری ۱۹۲۰ء دار العوام میں وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں فرمایا:۔

"میں اب اُس وعدہ کا ذکر کرتا ہوں جو جنوری ۱۹۱۸ء میں کیا گیا تھا سب فریقین کے مطالبات کا لحاظ کرکے وہ وعدہ کیا گیا تھا اور مسٹر اسکوئیتھ اور لارڈ گرے نے بھی اس کو تسلیم کیا۔ اس بیان میں قومی نقطہ خیال سے جنگی مقاصد کی تشریح کرنا منظور تھی اور یہ ایک ایسا بیان تھا جس سے سب فریقین کو متفق ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ متفق ہوگئے۔ واقعی یہ کوئی تقریر نہیں تھی بلکہ یہ ایک بیان تھا جس کو نہایت احتیاط کے ساتھ

پہلے سے مرتب کر لیا گیا تھا" وزیر اعظم نے اس تقریر کے دوران میں
جس کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا صریح طور پر یہ کہا ہے کہ اس بیان میں ٹرکی کے
متعلق شرائط کو پیش نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ سلطنت برطانیہ کے کل مسلمانوں
کے ساتھ ان الفاظ میں ایک سنجیدہ وعدہ تھا "ہم نے ایک سنجیدہ وعدہ کیا
ہے اور انھوں نے اس کو قبول کر لیا" اس میں انھوں نے اضافہ کیا تھا
"ان میں یہ سن کر کہ ہم اس معاہدہ کے شرائط پر کاربند نہیں ہوں گے ایک
قسم کی بے چینی پیدا ہو گئی" یہ بھی کہا کہ "یہ اعلان نہایت سوچ سمجھ کر
نہایت غور کے بعد کیا گیا تھا۔ جلسۂ وزرا نے اس کا مسودہ تیار کیا تھا"

روما کی بت پرست سلطنت نے ان لاطینی ممالک کو اپنے زیر اثر
کیا جو کہ وفادار رہے تھے اور ہنی بال کے ساتھ لڑے تھے اور ان کو اٹلی
سے نکال دیا تھا۔ برطانیہ اعظم نے اپنے چکنے چپڑے الفاظ اور سنجیدہ
وعدوں سے ہندوستانی رعایا کو اس بات کی ترغیب دی تھی کہ وہ لڑیں
اور ان کے دشمن کو پسپا کریں۔ لیکن جب کامیابی ہو گئی تو انکے خیالات
اور ان کی التجاؤں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ خلافت کے مسئلہ میں مسلمانوں کے
جذبات کی نہایت اہانت کی گئی۔ باوجودیکہ ٹرکی کی شرائط کا غیر منصفانہ
ہونا خود لارڈ چیمسفورڈ نے ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے:۔
"کوئی شخص یہاں تک کہ وہ مسلمان بھی نہ ہو مجھ سے زیادہ ٹرکی

نامے کے شرائط کو ناپسند کیا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ گورنمنٹ
نے ترکی شرائط کے جواب میں جو بیان شائع کیا ہے وہ اس سے کس درجہ
مختلف ہے۔ جو ہماری گورنمنٹ کے رویہ کی یکرنگی۔

ہماری رائے میں دول یورپ سے کسی انصاف یا اچھے سلوک کی
امید رکھنا عبث ہے۔ جس چیز کا ترقی کے آثار سمجھ کر خیر مقدم کرنا چاہیے
اس کو بے چینی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ الفاظ جو مغربی زبانوں میں مشرقی
میں سمجھے جاتے ہیں ان کی اہمیت جاتی رہتی ہے اور جو حقیقی مقصد ہو سیاسی
چیز ہے جیسا کہ یورپ میں ترقی کی چیز کہلاتی ہے مشرق میں شورش کہا جاتا ہے ایشیا میں
اس کا نام مذہبی دیوانگی رکھا گیا ہے۔

شہنشاہیت کا نام یورپ میں نہایت مقدس معنی رکھتا ہے۔ اس کے
تحت میں کمزور قوموں کی آزادی سلب کرنے کے لئے صلیبی لڑائیوں
کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے ہمارے کانوں
میں میناروں سے تہذیب پھیلانے والے مشن کی صدا ابھی آتی ہے
جو تہذیب آواز دہل ہتھیاروں کی جھنکاروں کے ساتھ ہم تک پہنچائی
جاتی ہے۔ وہ پتلونوں اور چھجے دار ٹوپیوں، شراب نوشی زنا امراض
اور خودکشی کی صورت میں ہوتی ہے اور یہاں پہنچکر اُن بے قاعدگیوں
کی قلعی کھل جاتی ہے جس سے تہذیب جدید کا مطالعہ اس کے مکرو

فریب کی مجوزن ہر کیب کے ایک دلچسپ چیز بن جاتا ہے۔" (امیر علی) عدل و انصاف کے لئے ہمیں اپنی کوششوں پر جو متحد اراد ے اور صاف دلی پر مبنی ہوں بھروسہ کرنا چاہیئے۔ اسلام اور حقیقتاً کل ایشیا کو اس واقعہ کا احساس کرنا چاہیئے اور یہ احساس جس قدر جلد ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ مادہ پرست یورپ کی نگاہیں ایشیا کی عمدہ چیزوں پر لگی ہوئی ہیں "تیل" اور "کوئلے" کی تہذیب کے بنانے والے مشرقی روحانی تہذیب کی قدر نہیں کر سکتے۔

حقیقت میں وہ اسلام اور ایشیا کی روحانیت ہی پر حملہ کر رہے ہیں۔ مغرب کے لوگوں میں پان اسلامزم (اتحاد اسلام) کے اندیشہ اور سیاہ خطرہ اور اسی قسم کے دیگر خدشات کا چرچا ہے لیکن تیل اور کوئلہ کے خطرے کے مقابلہ میں جو ایشیا کو دھمکی دے رہا ہے یہ خطرات کیا چیز ہیں؟ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے جو ہمیشہ سے زیادہ تباہ کن اور خطرناک ہے۔ ایشیا بلاشبہ اپنے تمام ذرائع کو جو اس کے امکان میں ہیں کام میں لائے گا اور ہر قسم کی امداد جو اُسے مل سکتی ہے مُلک کے ہر گوشہ سے طلب کرے گا۔ مذہبی جذبات ضرور کام میں لائے جائیں گے اور اسی طرح لٹیروں کو روکنے کے لئے قدامت پسندی کا جوش۔ غیر ملکی عادات و طریق کے خلاف تعصب اور تمامی

دیگر طاقتیں جو میسر آسکیں کام میں لائی جائیں گی۔

ایشیا کی نجات جیسا کہ انسانوں کے بڑے لیڈر اور سوچنے والے مہاتما گاندھی محسوس کرتے ہیں عام طور سے ہندوستان پر منحصر ہے بلاشبہ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں واقعات کی جو رفتار ہوگی وہ تمام دوسری چیزوں سے زیادہ اسلام اور ایشیا کی قسمت کا مستقبل قریب میں فیصلہ کرنے والی ہوگی۔ ایک مرتبہ روحانیت کو پھر فتح حاصل ہوگی اور مادیت پسپا ہو جائے گی۔ شب کا تاریک ترین پردہ ہر چیز پر غالب آجاتا ہے لیکن دن کے صبح صادق کی روشنی اس کی تاریکی کو معدوم کر دیتی ہے۔

خلافت اور انگلستان

رایوں کا خلاصہ

مولانا محمد علی فرماتے ہیں: - خلافت کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت تھی اس کمی کو ڈاکٹر سید محمود نے نہایت خوبی سے پورا کر دیا -

مولانا ابوالکلام آزاد مستند انگریزی تحریرات کی سخت کمی محسوس کی جا رہی تھی - ڈاکٹر سید محمود کے رسالے کی بروقت اشاعت اس کمی کو نہایت عمدہ طور پر پورا کر دے گی - نہایت قابلیت کے ساتھ خلافت کی تاریخ پر نظر ڈالی ہے -

مولانا شوکت علی یہ کتاب ہر پہلو سے قابلِ قدر ہے - یہ ایک نادر تصنیف ہے - اس کا ترجمہ ہندوستان کی ہر زبان میں ہونا چاہیئے -

پرنسپل نیشنل مسلم یونیورسٹی ڈھائی سو کاپیاں مجھے بھیج دیں چاہتا ہوں کہ اسے نیشنل مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کر لوں

مسٹر مظہر الحق پٹنہ اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی نہایت قابلانہ و منصفانہ طور پر اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے -

مسٹر پکتھال اڈیٹر بمبئی کرانیکل یہ ایک نادر اور بیش بہا تصنیف ہے۔

مسٹر تصدق احمد خاں شروانی سکریٹری نیشنل مسلم یونیورسٹی مسئلہ خلافت پر نہایت قابلانہ اور محققانہ بحث کی گئی ہے۔

پروفیسر سید محمد علی شاہ سندھ خلافت کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ بہت کچھ اس سے رفع ہو جائیں گی۔

خواجہ حسن نظامی ترتیب کی نفاست اور سلسلۂ تاریخ کا ربط اور خاص خاص پہلو ایسے ہیں جن کی ہر جگہ تعریف کی جائے گی۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو اس میں بہت سے ایسے نئے تاریخی واقعات ہیں جن کا ابتک لوگوں کو عام طور پر علم نہ تھا۔

مولانا رشید احمد صاحب پروفیسر نیشنل یونیورسٹی علیگڈھ اس موضوع پر بہترین کتاب ہے جو میں نے دیکھی ہے۔

مولانا اسلم جیراجپوری اس کتاب سے مسلمان اس مسئلہ کی حیثیت سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے۔

اسیر مالٹا کا پیغام

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی اسیر مالٹا و کراچی کی ولولہ انگیز تاریخی تقریروں کا مجموعہ جس میں یورپ کے مظالم ترکوں و مسلمانوں پر مالٹا کی کیفیت۔ یونان کی حالت وغیرہ مفصل دکھائی

نقارۂ مولانا ظفر علی خاں

فدائے ملت مولانا ظفر علی خاں کی راولپنڈی۔ لاہور۔ کلکتہ۔ الٰہ آباد وغیرہ کی تقریروں کا مجموعہ

دنیائے اسلام اور خلافت

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کا زبردست خطبۂ صدارت جس میں مولانا نے یہ دکھلایا ہے کہ اس وقت چین۔ آذربائیجان مراکش۔ طرابلس۔ افغانستان الجزائر وغیرہ کے مسلمان خلافت کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ ۴/

خون حرمین

مکہ معظمہ میں شریف کے مظالم ترکوں پر مدینہ منورہ کے محاصرے کے حالات۔ گنبد خضرا پر توپ اور ہوائی جہاز کا اُڑنا۔ دیار مقدس میں گولوں کی بارش۔ خدام حرم کی تکالیف۔ غلاف کعبہ کے جلنے کی کیفیت۔ از مولانا غفور شاہ صاحب الحسامی الوارثی۔ ۸/

سمرنا کی خونیں داستان

سمرنا میں یونانی مظالم کی تفصیل۔ مثلاً عورتوں کی عصمت دری بوڑھوں اور بچوں کا قتل عام شہر اور دیہات کا جلایا جانا۔ مساجد اور معابد کی بربادی وغیرہ۔ ۳/

خطبۂ صدارت مولانا آزاد سبحانی

بہترین سیاسی اور مذہبی مضامین سے بھرا ہوا خطبہ نظام شرعیہ کی پوری تفصیل ۶/

جذبات حریت۔ بہترین قومی نظموں کا مجموعہ جس سے بہتر مجموعہ اس وقت تک شائع نہیں ہوا اس دعوے کو آپ دیکھ کر تصدیق کر سکتے ہیں تمام لیڈران نے پسند کیا ہے۔ بہترین اخبارات نے ریویو کیا ہے ۸/

مشتاق احمد ناظم قومی دار الاشاعت محلہ کوٹلہ شہر میرٹھ